

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

150

سچا وعدہ

ڈاکٹر ظہیر حسین کی
کی تصنیف الودع الحق کا
اردو عکس

ناشران

ولی محمد اینڈ سنز تاجران کتب

اوٹ رام روڈ - پاکستان چوک - کراچی

(مشہور آنسٹ ایجوکیشن کراچی)

فہرست مضامین

صفحہ	مضامین	نمبر	صفحہ	مضامین	نمبر
۲۵۵	مدینہ کی ہجرت	۱۲	۷	ترک وطن	۱
۲۶۱	دینی شوق ہو تو ایسا ہو	۱۷	۱۵	معاہدہ	۲
۲۶۹	رسول اللعالمین کے ایک ضاکار خادم	۱۸	۲۳	شادی خانہ آبادی	۳
۲۷۵	جنگ بدر	۱۹	۲۹	مکہ میں ایک نیا انقلاب	۴
۲۸۵	مؤذن رسول اللہ	۲۰	۴۱	ایک خطرناک خواب	۵
۲۹۳	شہادت کی بصارت	۲۱	۵۱	غیر عادلانہ مطالبہ	۶
۲۹۹	انصار کا فتنہ	۲۲	۵۹	نئے انقلاب کی برکتیں	۷
۳۰۳	فاروق اعظم کا دور خلافت	۲۳	۶۵	اسلام مٹانے کی ناکام کوشش	۸
۳۱۳	صحابی رومی کی امامت	۲۴	۷۹	ایک اور غضب ہو گیا	۹
۳۱۹	امامت و حکم جنگ	۲۵	۹۵	ابرمہ کی تباہی	۱۰
۳۲۵	وزیر تعلیم و مال	۲۶	۱۴۱	اس ننھی سی جان پر یہ ظلم و ستم	۱۱
۳۲۹	ابن مسعود کی لسانی ٹوٹ گئی	۲۷	۱۵۷	ایک امت کا چرہ ادا	۱۲
۳۳۶	بغاوت	۲۸	۱۸۱	سالم کو نین خریدوں گی	۱۳
۳۴۸	عمار کا قاتل جہنمی ہے	۲۹	۱۹۹	ہیں جان و دل سے پیارے محمد	۱۴
۳۵۱	نتیجہ	۳۰	۲۱۵	جو ستم کار یکاڑو توڑ دیا	۱۵

۲۹۴۵۹۲
ط ۱۰۹
۱۱۲۲۲

پیش لفظ

ترجمہ کا کام کچھ آسان نہیں ہے۔ کسی زبان کو کسی دوسری زبان کے محاورات میں ڈھالنا بڑا مشکل کام ہے، خصوصاً عربی زبان کو جس کی وسعت کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو اس زبان پر پوری قدرت رکھتا ہو۔ کیونکہ اس کا ہر لفظ اپنے دائرہ میں کافی پھیلاؤ اور ہر دست رکھتا ہے۔ پھر اسے اُس زبان جو ایسا لفظی طور پر اس زبان سے ڈھالنا اور اس کے پورے مفہوم کو ہو بہو ادا کر دینا معمولی کام نہیں۔ "الوعد الحق" کا ترجمہ آپ کے سامنے ہے، مصنف کے مفہوم کو قریب تر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ امید ہے قارئین کرام کو پسند آئے گا اور اسے وہ پوری دلچسپی سے پڑھیں گے۔ اندازہ بیان میں ندرت ہے اور اظہارِ فکر میں جدت ہے اسی خاصی جانشینی پیدا کر دی ہے، جو نئے ذہنوں اور موجودہ تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اس میں چند جاں نثار اور بے کس و منظلوم مسلمانوں کی داستان ہے۔ جنہوں نے اسلام کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ پھر حق تعالیٰ نے انہیں سر بلندی اور غیر معمولی عزت عطا فرمائی۔

فقر اللہ، غلام آغا اور محکم حاکم بن گئے۔
 زمین چمن گل بیک لائی سے کیا کیا
 بدلتاے رنگ آسماں کیسے کیسے

الحمد للہ ترجمہ کا آغاز، دسمبر ۱۹۵۹ء سے ہوا اور سات دن میں
 ۱۵ اپریل ۱۹۵۹ء کو ختم ہو گیا۔ الشریک مصنف کو مترجم کو اور ناشر کو
 ایمان پر ثابت قدم رکھے اور ان کا خاتمہ بخیر کیے۔ آمین

جب ہم واپسین ہو یا اللہ
 لب پہ ہو لا الہ الا اللہ

ساعب رحمانی

مدیر الريحان

ذی قعدہ ۱۳۸۰ھ



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
 وَعَدَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
 لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ
 مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ فِیْهَا الَّذِیْنَ رَضِیَ
 لَهُمْ وَّ لَیَبَدِّلَنَّ لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اٰمٰنًا یَعْبُدُوْنَ
 لَا یَشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْءًا وَّ مَنۢ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُوْتِیْكَ
 هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○

النورہ ۲۴: ۵۵

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے مہی تھے تعالیٰ ان سے وعدہ فرماتا ہے
 کہ انہیں ملک میں پہلے لوگوں کی طرح حکومت عطا فرمائیگا
 جس دین کو ان کے لئے پسند فرمایا ہے اس کی انہیں قوت
 بخش دے گا اور انہیں خوف کے بعد امن عنایت فرمائے گا
 بشرطیکہ وہ میری عبادت کرتے رہیں اور میرے ساتھ کسی چیز
 کو شریک نہ کریں اور جو شخص اس (نعمت) کے بعد ناشکری کریگا
 وہی نافرمان ہوگا۔

(سورہ نورہ ۵۵)

ترکِ وطن

یاسر (اپنے بھائی مالک اور عارث سے): "اگر تمہارا جی چاہے تو میں چلے جاؤ یا کہیں اور نکل جاؤ، میں تو یہیں رہوں گا، یہ سر زمین مجھے دل و جان سے زیادہ پیاری ہے، کوئی ملک بھی اس کے برابر نہیں۔ یہ گھر مجھے بے حد محبوب ہے۔ کوئی اور گھر کیوں ڈھونڈھوں تم ہی بتاؤ بھلا میں اُس جگہ سے کیسے ہٹنا پسند کروں جہاں مجھے خوف کے بعد امن، کمزوری کے بعد طاقت اور تنگی کے بعد فراخی کی صورت نظر آئی۔ جہاں مجھے چین نصیب ہوا، اور آرام و راحت کی زندگی ملی۔"

مالک: "نہیں نہیں یوں فرماؤ میں یہ جگہ کس طرح چھوڑ دوں، جہاں یا سیاہ نام نوجوان دو شیرہ رہتی ہے، جس کے سیاہ و سفید کے تم مالک نہیں ہو بلکہ اسے تم پر پورا اختیار حاصل ہے۔"

یاسر: "تمہیں اختیار ہے جو چاہو گمان کرو، لیکن میں یہاں سے نہیں جانے کا، مرتے دم تک یہیں رہوں گا۔"

حارث ارضیوں کا اور دانت پیس کرنا کم بخت چھپر خدا کی پھٹکا ہو
 تجھے اپنے وطن سے زیادہ پرزبانی، فحطان سے زیادہ مضرا اور عس سے
 زیادہ قریش پیارے ہیں۔ لعنت ہو تجھ پر یا خدا کی قسم تو یہاں ذلیل و خوار
 ہوگا، طرح طرح کے مصائب جھیلے گا، جان جو کھول میں ڈالے گا اور کسی
 کو حمایت کے لئے ڈھونڈے گا بھی تو کوئی حمایتی نہ ملے گا، تجھ پر کسی
 کو ترس نہ آئے گا، اور اگر آئے گا بھی تو تجھے ذلیل کرنے کے لئے اور
 دشمن کو تیرے خلاف حرکت کرنے کے لئے، ہوش کے ناخن لے، ابھی
 وقت سے خوب سوچ سمجھ لے۔"

مالک: رحمت بھرے لہو میں "درا خیال تو کرو یہ نوجوان کالی کلوی
 لونڈی کڑ کی خاک سے تو پیدا ہوئی نہیں، اور نہ ہی یہاں کے
 آسمان سے ہلک پڑی ہے، دوسرے غلاموں کی طرح یہ بھی باہری
 سے لائی گئی ہے، باس جیسی ہزاروں لوٹیاں ہر منزل اور ہر ٹھکانے
 پر مل سکتی ہیں، اور اگر اسی پر گرویدہ ہو تو ہم کسی نہ کسی تہ پیر سے
 اس کو بھی تہ سے نکال لائیں گے، پھر تم اپنی اسی جمیہ کے ساتھ
 زندگی کے ایام آرام و صلح سے گزارنا، اور اپنے بھائیوں اور دوستوں
 کے ساتھ غربت و وفار سے رہنا۔"

سرد۔ بات جس طرح چاہو بناؤ اور بگاڑو، میں تو یہاں سے ملنے

⑨

ہیں، خدا کی قسم میں کسی قیمت پر بھی اس پاک گھر کو نہیں چھوڑ سکتا
یہ میرا طرف نہیں کہ ابو خلیفہ کے احسانات کا بدلہ احسان فراموشی سے
دوں اور اس کی نیکی کو بدی سے بدل دوں، ناممکن ہے کہ میں اس
کے مال میں خیانت برداشت کروں۔ میں اس کا احسان کیسے بھول
جاؤں، وہ تو ہمارا محسن ہے جس نے ہمیں پناہ دی، ہمیں مہمان رکھا،
ہماری خوب خاطر تواضع کی اور مہمان لوازی کا حق ادا کر دیا، میں
عرض کر چکا کہ اگر تم چاہو تو میں چلے جاؤ یا کہیں اور نکل جاؤ، میں نے
اس مقدس جگہ کو اپنا وطن بنا لیا ہے، میں یہاں سے آخری دم
تک نہیں ہٹنے کا، میرا دل پکار رہا ہے کہ یہ جگہ میری منتظر ہے،
قدرت مجھ سے یہاں کچھ کام لینا چاہتی ہے۔“

حارث:۔ (رنداق اڑاتے ہوئے) ٹھیک ہے یہ جگہ تم سے غلامی کی
خدمت لینا چاہتی ہے، جس ذلت پر تم راضی ہو جاؤ گے، تمہارا انداز
تو یہی بتا رہا ہے کہ تم اپنے پاؤں پر آپ کھلاڑی مارو گے اور عزت
کی زندگی چھوڑ کر ذلت کی زندگی اختیار کرو گے۔ بفرض حال اگر
لوگوں نے کچھ ہمدردی کی بھی اور تمہارے ساتھ حسن سلوک کیا
بھی تو زیادہ سے زیادہ اپنا حلیف بنالیں گے، اس میں بھی ذلت
ہی ذلت ہے، دوسروں کے دست نگر رہو گے اور خود کفیل نہیں ہو گے۔“

یا سرزمین تم لاکھ سمجھاؤ اور ہزار جتن کرو لیکن میں یہ جگہ نہیں چھوڑوں گا،
 میں نے اس کو وطن بنایا ہے اور آخری دم تک یہیں رہوں گا۔“
 حارث (ناامید ہو کر، بالک سے) چھوڑو اس بد دماغ کو، اس کو تو سمجھانا
 بھی بے سود ہے۔ کم نجت کو پچھتانا اور کف افسوس ملتا پڑے گا۔“

دوسرے دن جب دن کافی چڑھ گیا تو دو آدمی ابو خلیفہ کے
 دیئے ہوئے دو اونٹ ہنکاتے ہوئے مکہ سے نکلے نظر آئے، ان
 کے ساتھ ساتھ ان کا بھائی یا سر بھی جلدی جلدی چل رہا تھا۔ سفر
 کے لئے نہیں بلکہ اپنے بھائیوں کو رخصت کرنے کے لئے۔ اصل بات
 یہ ہے کہ یہ تینوں بھائی اپنے وطن یمن سے اپنے ایک گھوڑے ہوئے
 بھائی کو تلاش کرنے کے لئے نکلے تھے۔ کافی عرصہ تک ادھر ادھر شہر
 در شہر گھومے، زمین کا چپہ چپہ چھان مارا مگر بھائی کا سراغ نہ ملتا تھا
 نہ ملا۔ آخر ناامید ہو کر واپس لوٹے۔ راستے میں مکہ پڑتا تھا، چونکہ اس
 نامعلوم سفر نے انہیں تھکا مارا تھا اور راہ کی صعوبتوں اور سفر کی
 مشکلات نے انہیں لاغر و کمزور کر دیا تھا، اس لئے یہاں پہنچ کر کہتے
 گئے آؤ اس بستی میں کچھ دنوں آرام کر لیں، تھکن بھی دور ہو جائیگی
 اور یہاں کے عبادت خانے کا طواف بھی کر لیں گے۔ دیوتاؤں سے

دعائیں بھی مانگ لیں گے اور سفر خرچ بھی لوگوں سے مانگ کر
 دکھٹا کر سکیں گے۔ آخر مکہ معظمہ میں اتر پڑے، بیت اللہ کا طواف کیا،
 دیوتاؤں سے لمبی چوڑی دعائیں بھی مانگیں، مگر افسوس وہاں سے بھی
 مسئلہ حل نہ ہو سکا، پھر مسجد میں ٹھہر گئے اور بے صبری سے قریشیوں کی
 کی انعقاد مجالس کا انتظار کرنے لگے، جب دوسرے دن کا سو بچ کافی
 چڑھ گیا تو ابو خدیفہ بن مغیرہ مخزومی وہاں سے گذرا، ابو خدیفہ ان
 کی حالت زار دیکھ کر بیجا اور مسکرا کر ان سے کہنے لگا، میرے ساتھ آؤ
 اور میرے غریب خانے پر ٹھہر جاؤ۔ اُس نے گھر لے جا کر انھیں بخت
 کی جگہ ٹھہرا دیا، اور قریشی روایات کے مطابق ان کی بڑی خاطر
 تواضع کی، اور بخت کے ساتھ کھلایا پلایا

ابو خدیفہ نے اپنے مہانوں کی خدمت پر اپنی نوجوان لونڈی
 سمیہ بنت خیاط کو مقرر کر دیا تھا، اُس کا رنگ سیاہ تھا جیسے اُٹا تو،
 لیکن چونکہ عنفوانِ شباب تھا اس لئے حسن و جمال کی شادابی اُس
 کے چہرے سے چمکتی تھی، چال متوالی، ادا دل بھانے والی اور ہاتھوں
 میں غضب کی پھرتی تھی۔ ہجو اگرچہ عربی نہ تھا لیکن اُس کی آواز میں
 بلا کارس تھا، جو کالوں میں شہد اور دلوں میں امرت بچوڑ رہا تھا
 یہ حبشی دوشیزہ صبح و شام مہانوں کا کھانا لایا کرتی تھی اور باقی

اوقات میں اُن کی دوسری خدمتیں انجام دیتی تھی، کبھی کبھی اُن کے پاس بیٹھ کر اُن سے باتیں بھی کرتی، اور اُن کی باتیں سن کر اپنا دل بہلا لیتی۔ رفتہ رفتہ یہ لڑکی پامسر کے دل و دماغ پر چھا گئی، اور اُس کی محبت اُس کے دل میں گھر کر گئی۔ یہی وجہ تھی کہ اُسے مکہ کی اقامت دل و جان سے پیاری تھی، کسی کو کیا خبر شاید پامسر نے اپنی جھین کا احساس اسے دلایا ہے، اور اس کے دل کو بھی اپنے دل کی طرح بے قرار پایا ہو۔

اُلفت کا جب مزاج ہے کہ ہوں وہ بھی بے قرار

دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

ایک دلگیر پردیسی کو دوسرے رنجور پردیسی سے اُنس ہوتا ہی ہے۔ کبھی کبھی اس نوجوان کو یہ خیال بھی آیا کہ دل پر جبر کر کے اپنے بھائیوں کے ساتھ وطن چلا جائے جہاں اُس کا غمزدہ بوڑھا باپ اور مصیبت زدہ بوڑھی ماں اس کے انتظار میں ہوگی، لیکن افسوس نوجوان اپنے ابادے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ بلاشبہ انسان کی زندگی اس کے ارادوں کی پابند نہیں اور نہ اُس کی خواہشوں کا ساتھ دیتی ہے۔ بلکہ کچھ پوشیدہ محرکات ہوتے ہیں جنہیں تقدیر محض اپنی مرضی سے کسی سے مشورہ کئے بغیر عمل میں لے آتی ہے۔

اور انسان چار و ناچار اسی طرف کھپتا چلا جاتا ہے۔ جدھر یہ
 محرکات اُسے لیجانا چاہتے ہیں۔ پھر یہ محرکات انسانی زندگی پر
 کچھ اس طرح اثر ڈالتے ہیں کہ انسان کے تصور کی رسائی بھی
 وہاں تک نہیں ہوتی۔

بہر حال مالک اور حارث دونوں اپنے اُونٹوں کو ہنکاتے ہوئے
 مکہ سے یمن پہنچ جاتے ہیں، دنیا اور تاریخ انہیں اس طرح فراموش
 کر دیتی ہے کہ اُن کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ اُن پر کیا بیتی؟
 جیسے اُن کا کھویا ہوا بھائی اور بوڑھے ماں باپ تاریخ و دنیا میں
 کھو جاتے ہیں۔ لیکن ہمارا نوجوان یا سردو لوں بھائیوں کو رخصت
 کر کے مکہ واپس آجاتا ہے، شروع شروع میں تو ابو خلیفہ کا خصوصی
 مہمان رہتا ہے، پھر اُس کا حلیف بن کر رہتا ہے، اور پھر اُس کی
 لونڈی سمیہ کا شوہر بن جاتا ہے، اسی تاریخ سے دنیا اُسے
 جانتی ہے اور تاریخ پہچانتی ہے۔

معادہ

آج پیارے تو نے بھی کیا جاتی دنیا دیکھ لی
 راہ پر آتے لگا، عہد وفا ہونے لگا
 ایک دن ابو حذیفہ اپنی مجلس سے اٹھ کر گھر جا رہا تھا،
 راستے میں مسجد کے قریب ہی یا سر سے ملاقات ہو گئی۔
 ابو حذیفہ (مسکرا کر): "عنسی نوجوان! تمہارے بھائی کہاں ہیں؟"
 عنسی نوجوان: "انہوں نے پردیس پر وطن کو ترجیح دی، اور اپنے
 ملک واپس چلے گئے۔"

ابو حذیفہ: "لیکن تمہیں پردیس بھایا اور یہیں مکہ میں رہ پڑے؟"
 عنسی نوجوان: "افسوس یہ بات نہیں، بلکہ مجھے ہمیشہ پسند اور
 فتنہ پرداز علاقوں کی بہ نسبت امن پسند اور صلح جو حرم مکہ پسند آیا"
 اور میں نے یمن جیسے گمراہ علاقوں کو چھوڑ کر اللہ کے گھر کی ہمسائیگی
 اختیار کر لی۔"

ابو حذیفہ: "اچھا اب تم مکہ میں کیا کام کرنا چاہتے ہو؟"

یا سر: اِدھر اُدھر سے چل پھر کر روزی تلاش کر لوں گا:
 ابو حذیفہ: روزی کی فکر نہ کرو، تم میرے بڑے ہی ہو، جب تک میرے پاس رہو گے تمہیں روزی کے کھانے نہیں۔“

یا سر (شکریے کے انداز میں): معزز سردار! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ فخر مخزوم، ناز قریش اور عزت بطحاء ہیں۔ خدا کی قسم جہاں تک مجھے معلوم ہے آپ بڑے فیاض طبع اور سلیم الفطرت انسان ہیں۔ آپ کے اخلاق حمیدہ سب کو محبوب ہیں، آپ مساکین کی خبر گیری اور فاقہ زدوں کی نگہداشت کرتے ہیں، آپ سائل کی مراد پوچھی کرتے ہیں، تنگ دستوں کو خوب دیتے ہیں، اور یتیمی اور مظلوم و بے کس کی پشت پناہی آپ کا محبوب مشغلہ ہے۔“

ابو حذیفہ: بس بس۔ تعریف ہو چکی، تم نے احسان کا احسان سے زیادہ بدلہ دے دیا، بلکہ تم نے تو تعریفوں کے پل باندھ دیئے، اور آسمان و زمین کے قلابے ملانے شروع کر دیئے، ماشاء اللہ بڑے فصیح و بلیغ ہو، اور بولنے پر کافی قدرت ہے، میں تمہاری ذکاوت و ذہانت کو مانتا ہوں اور فصاحت و بلاغت کا قائل ہوں۔ اب میری یہی خواہش ہے کہ جب تک تم اس بستی میں رہو میرے پاس ہی رہو۔“

یاسرؓ میں آپ کی اس پیشکش کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں، خدا آپ کو برائیوں سے محفوظ رکھے، شکر یہ اور صد شکر یہ، لیکن میری ایک ناقص رائے ہے جس سے ہم دونوں یکساں حالت میں رہیں گے، نہ آپ پر بوجھ پڑے گا اور نہ میں اپنی ذمہ داریوں سے غافل رہوں گا، آپ میرے بھی اپنے گھربار کی طرح پشت پناہ بن جائیں، پھر میں آپ کی طرف سے آپ کے دشمن سے جنگ کروں گا، اور صلح جوئے صلح کروں گا۔ آپ کے دشمنوں کا دشمن اور دوستوں کا دوست بن جاؤں گا۔ مقدور بھر آپ کی اور آپ کے خاندان کی ڈھال بن جاؤں گا۔

ابو حذیفہؓ: تب تو یہ ایک معاہدہ ہے!

یاسرؓ: بیشک، اگر آپ پسند فرمائیں؟

ابو حذیفہؓ: مجھے منظور ہے، اور میں اس معاہدے سے خوش ہوں! کل مسجد میں جا کر معاہدہ حلف کر لیں گے۔

یاسرؓ: ابھی تو مسجد کچھ دور بھی نہیں، یہ بات مجھے بے حد ناپسند ہے کہ آج کا کام کل پر ٹال دیا جائے۔

ابو حذیفہؓ: اچھا تو پھر آؤ چلیں۔

آخر ابو حذیفہ اپنے ہاتھ میں عنسی نوجون کا ہاتھ لے کر اٹھے پاؤں

چل پڑتا ہے، تھوڑی دیر میں دونوں مسجد میں پہنچ جاتے ہیں۔ ابو خدیفہ
 مسجد میں داخل ہوتے ہی کعبہ کی طرف چلنے کا قصد کرتا ہے۔
 یاسر: کہاں جا رہے ہو؟

ابو خدیفہ: معاہدے پر دیوتاؤں کو گواہ بنانے کے لئے!

یاسر (مسکرا کر) پہلے ان قریشیوں کو تو گواہ بنا لو، ایسا نہ ہو کہ یہ کہیں
 چلے جائیں اور تم انھیں ڈھونڈتے ہی رہ جاؤ، دیوتا تو جہاں ڈال دیے
 گئے ہیں وہیں پڑے چھین گے، کہیں آنے جانے کے نہیں!

ابو خدیفہ (چپیں چببیں ہو کر): میں نے آج جیسا ہوشیار اور عقلمند شخص کبھی
 نہیں دیکھا!

پھر ابو خدیفہ یاسر کو قریشیوں کی بیٹھکوں پر لے جاتا ہے، اور جس
 بیٹھک سے گذرتا ہے پکار کر کہتا ہے: قریشیو! گواہ رہنا میں نے اس
 فتسی نوجوان کو جس کا نام یاسر بن عامر ہے، اپنا حلیف بنا لیا ہے۔ جہاں
 جہاں یہ آواز پہنچتی ہے قریشی یہی جواب دیتے ہیں: بخوبی، بہت خوب
 ابو خدیفہ تمہیں مبارک ہو، تمہارا حلیف واقعی قابل عزت و لائق تعریف ہے۔
 جب ابو خدیفہ قریشیوں کی تمام بیٹھکوں میں گھوم جاتا ہے تو پھر
 کعبہ کا قصد کرتا ہے۔

یاسر: اب کہہ کر ارادہ ہے؟

حذیفہؓ اب تو دیوتاؤں کو گواہ بنانے دو! مسرا ہنس کر: "شاباش! تمہارے خیال میں اس وقت تمہارے دیوتا سو رہے تھے اور تمہاری بات نہیں سن رہے تھے، جب تم اپنے معاہدے پر ان کو گواہ بنا رہے تھے، اور اعلان کر رہے تھے۔ یقیناً وہ بیدار تھے، سن رہے تھے، تمہارا اعلان دیوتا سن چکے، اس کے گواہ بن چکے، اور ان کو اپنی پر راضی بھی ہو چکے۔ معلوم ہوتا ہے تمہارے خیال میں دیوتا اسی بات سنتے ہیں جب ان کے پاس آکر کہا جائے، ٹھیک اس طرح جس طرح ہم آپس میں سرگوشی کرتے وقت ایک دوسرے کے بالکل قریب جاتے ہیں۔"

ابو حذیفہ (چونک کر): "کیا آج میں نے کسی شیطان کو حلیف بنا لیا ہے؟ کسی نوجوان! خدا تجھے سمجھ دے، ہمارا یہی طریقہ ہے کہ جب دیوتاؤں سے کوئی بات کہنی ہوتی ہے تو ہم ان کے بالکل پاس جا کر ایک کاناپھوسی کرنے والے کی طرح کھڑے ہو کر عرض کرتے ہیں۔"

پاسرا: "دیوتاؤں سے تو جہاں سے چاہو کہہ سکتے ہو، ان کی شان کے مطابق ہی ہے کہ وہ تمہاری بات ہر جگہ سے سن لیں اور ہر جگہ تمہارے پاس موجود ہوں۔"

ابو حذیفہ: یہ بات سن کر ایک گہرے فکر میں ڈوب جاتا ہے، گویا

عنسی نوجوان اُسے کوئی ایسی بات یاد دلا دیتا ہے جو اُس کے ذہن
بکل چکی تھی، یا وہ خود اُسے بھلا چکا تھا۔

ابو خدیفہ (بھڑا کر): عنسی نوجوان! اگر تجھے معاہدہ کرنا ہے تو یہ بات
پڑے گی کہ ہم بیت اللہ کا طواف کریں، تاکہ اس معاہدے کی حرمت
تقدیس کا پورا پورا حق ادا ہو جائے۔

یاسر: اچھا نہیں مانتے ہو تو نہ مانو، جو تمہاری مرضی ہو وہی کر لو،
اگر مانو تو اسے قسمت نہ مانو تو شکایت کیا
میرے تسلیم خم ہے، جو مزاج یار میں آئے

آخر کار دونوں بیت اللہ کے دو تین طواف کرتے ہیں، اور پھر
کو ایک دوسرے کے حلیف بن کر گھر کو لوٹتے ہیں۔ لیکن ان کا باہمی
دو حلیفوں کے باہمی رشتہ سے کہیں زیادہ گہرا اور مضبوط ہے۔

ابو خدیفہ (گھر آتے ہوئے): عنسی نوجوان! افسوس اور صد افسوس! معاہدہ
ہوتا ہے تو ہمارے دیوتاؤں کو حقیر سمجھتا ہے اور ان سے انحراف کرتا ہے
کیا بات ہے، کیا ابھی عنس کے دیوتاؤں کی محبت تیرے دل سے
نہیں گئی؟ اور دوسرے دیوتاؤں کی طرف تیرا دل مائل نہیں ہوا؟
یاسر: ابو خدیفہ! میرے ماں باپ تم پر قربان، خدا کی قسم مجھے تو
سے بھی عنس کے دیوتا یاد نہیں آتے، مجھے ان سے عقیدت ہی نہیں

معلوم نہیں کہ کبھی کسی وقت دن یا رات میں میں ان کے پاس ہوں، یا میں نے کبھی ان کا ادب و احترام کیا ہو، یا کسی وقت ان عظمت و سطوت کو تسلیم کیا ہو۔“

حذیفہؓ: اے اے معلوم ہوتا ہے تم باپ دادا کا دین چھوڑ چکے ہو، کے دیوتاؤں سے بدظن ہو گئے ہو، اور یہودیوں اور عیسائیوں کے کو مانتے ہو!

میرا: میرا سب سے میل جول ہے، سب سے صاحبِ بھلا مت ہے، کے عقیدے جانتا ہوں، مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا، نہ میں نے سمجھنے کی کوشش کی!

حذیفہؓ: واہ واہ واہ واہ! تمہارا کوئی دیوتا ہی نہیں، اور تمہارا کوئی بے ہی نہیں۔“

میرا: ابو حذیفہ! ذرا سوچو تو سہی اگر میں کسی کو اپنا معبود بناتا تو بدر کو نہ بنا لیتا، جو مجھے مرعوب و دہشت زدہ بنا دیتا ہے جس کی وسعت بکرائی کو دیکھ کر میں ہکا بکا رہ جاتا ہوں، یا سورج کو نہ بنا لیتا جس کی شئی سے دن بھر فائدہ اٹھاتا ہوں، یا تاروں کو نہ بنا لیتا جو رات میں لے ہوئے مسافر کو راستہ بتاتے ہیں یا بادل کو نہ بنا لیتا، جن سے کھانے کی چیزیں پیدا ہوتی ہیں، لیکن میں کسی کو بھی اپنا معبود نہیں مانتا،

میرا دل کسی پر نہیں جتا، میں راستہ ڈھونڈ رہا ہوں، مگر اب تک
 نہ سکا، ہدایت تلاش کر رہا ہوں، مگر ہنوز راہ مستقیم سے دور ہوں،
 میں سے کسی کی اطاعت و الیقاد کی مجھے ضرورت نہیں، میں توپے
 کی تلاش میں ہوں، مجبور ہو کر دنیوی طور پر لوگوں سے ملا جلا رہتا
 لیکن دینی اعتبار سے ان سے علحدہ ہوں۔“
 ابو عذیفہ بدلتے سے: تمہارا معاملہ تو بڑا عجیب و غریب ہے، عنسی نو
 یاسر! ان چینیہ دوسروں کا ہے، بس اتنا سا فرق ہے، کہ میں
 کچھ غور و فکر کرتا ہوں اور لوگ کم سوچتے ہیں۔“

۱۱۳۲۲ اتنے میں ابو عذیفہ کا گھر آ جاتا ہے، گھر ہو چکا بھی دونوں
 بات چیت ہوتی رہتی ہے، اور کافی رات گئے تک سلسلہ کلام جو
 رہتا ہے۔ خود حجاز اور تہامہ و مین کے واقعات چٹ جاتے ہیں
 ابو عذیفہ کے دل و دماغ پر یہ نوجوان چھایا رہتا ہے، وہ اس حد
 تک ہے کہ خود بخود دل ہی دل میں اور بعض وقت
 اس سے کہنے لگتا ہے ”مجھے کبھی کسی پر دلیسی سے ایسی
 نہیں ہونی جیسی اس عنسی نوجوان سے ہو گئی ہے، اگر میں کسی
 بناتا تو۔ اسی نوجوان کو بناتا۔“



شادی خانہ آبادی

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت سے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ایک زمانے تک یاسر ابو خذیفہ کا ہمان رہتا ہے، روزانہ
صبح مسجد جاتا ہے، قریشیوں سے باتیں کرتا ہے اور ان سے
تبادلہ خیالات کرتا رہتا ہے، پھر زوال کے بعد گھر واپس آتا ہے
کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرتا ہے، پھر بازار میں چل پھر کر لوگوں
سے ملتا جلتا ہے، ان کے حالات معلوم کرتا ہے اور روزگار
تلاش کرتا ہے۔ جب روزگار ہوتا ہو جاتا ہے اور کچھ روپیہ جمع
ہو جاتا ہے تو خیال پیدا ہوتا ہے کہ اپنے ذاتی گھر میں رہائش
اختیار کرنی چاہیے۔ آخر کار ابو خذیفہ کو اپنے اس نیک ارادے
سے مطلع کرتا ہے، ابو خذیفہ کی نگاہ میں بھی ذاتی گھر میں منتقل ہو جانا
ٹھیک ہے، لیکن ابو خذیفہ یاسر کو کچھ فکر میں ڈوبا ہوا سادہ دیکھتا ہے

معلوم ہوتا ہے یا سر کا دل کسی کشمکش میں مبتلا ہے کیونکہ وہ
 گھر کے در و دیوار کو حسرت بھری نگاہوں سے تک رہا ہے
 در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
 خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں
 گویا انتقال مکانی سے یا سر کا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے۔
 میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے

میری یاد تجھ کو دلانا رہے گا
 ابو حذیفہ: غسی نوجوان! آج میں تمہیں کچھ کھویا کھویا اور دیکھ
 دیکھ رہا ہوں، بتاؤ تو یہی آخر کیا بات ہے؟ کیا میرے گھر سے
 تنگ آگئے ہو یا کسی سے کچھ تکلیف پہنچی ہے؟ یہاں کیوں
 نہیں ٹھہرے رہتے جیسے اب تک ٹھہرے رہے۔ جب کام کاج
 ختم جائے گا اور آسودہ حال ہو جاؤ گے، پھر منتقل ہو جانا۔“

نوجوان: خدا کی قسم مجھے تمہارا گھر برا معلوم نہیں ہوا، اور نہ مجھے
 کسی سے کچھ تکلیف پہنچی، میں نے تمہارے پاس ٹھہر کر بڑا آرام
 پایا اور ہر طرح کی خاطر تواضع دیکھی۔ بات یہ ہے کہ تمہارے
 گھر میں میری ایک محبوب چیز ہے۔ شروع شروع میں تو میرا
 خیال تھا کہ شاید اُسے نہ پا کر مجھے صبر آجائے گا، اور نظروں سے

اوجھل ہوتے ہی میں اُسے بھول جاؤں گا۔ لیکن مجھے تو ایسا معلوم
 ہو رہا ہے کہ اس کے بغیر میری زندگی وبالِ جان ثابت ہوگی۔
 ابو حذیفہ رحیران و متعجب ہو کر: تمہاری محبوب چیز! بھلا اس گھر میں
 تمہاری محبوب چیز کیا ہو سکتی ہے؟ بتاؤ تو یہی وہ ہے کیا؟
 نوجوان تھوڑی دیر تک سر جھکائے رکھتا ہے، شرم و
 حیا اُس کے چہرے پر سُرخ جھلکا دیتی ہے، گویا ایک سُرخ و
 لطیف ابر اُس کے چہرے پر چھا جاتا ہے۔ پھر سر اٹھاتا ہے،
 جیسے کسی اہم فیصلے پر قطعی راضی ہو گیا ہے، ذرا جرأت سے
 کام لیتا ہے اگرچہ حیا دامنگیر رہتی ہے، لیکن پھر بھی دل
 مضبوط کر کے آگے بڑھتا ہے۔

نوجوان (شرماتے ہوئے):۔۔۔ یہ جو تمہاری سیباہ نام لونڈی ہے،
 جسے تم سمیٹتے ہو، اُس کی محبت میرے دل و دماغ پر چھا گئی ہے،

بے چین ہے بے تاب ہو، معلوم نہیں کیوں

دل ماہی بے آب ہے، معلوم نہیں کیوں

دیکھا تھا کبھی خواب سنا، معلوم نہیں کیا

اب تک اثر خواب ہے، معلوم نہیں کیوں

خدا کی قسم وہ عصمت تاب خاتون ہے، میں نے اُس کی نگاہ میں

شرم و حیا کے سوا کچھ نہیں دیکھا، اور نہ کچھ ایسی ویسی بات دیکھی۔
ابو حذیفہ: "اچھا تمہاری یہ آرزو ہے کہ اسے تم کو دیدیا جائے۔"
نوجوان: "نہیں نہیں، خدا کی قسم نہیں، میں تمہارا مال لے کر تمہیں
تکلیف دینا نہیں چاہتا۔"

ابو حذیفہ: "یہ تکلیف نہیں عین راحت ہے، مال میں تکلیف کا
سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میرے گھر میں بہت سی لونڈیاں ہیں اگر
سمیٹ نہ ہوگی نہ سہی، لیکن تمہارا دل میلانا ہو۔"

نوجوان: "نہیں نہیں، ہرگز نہیں، میرا دل نہیں چاہتا کہ تمہیں میری
وجہ سے کوئی مالی نقصان پہنچے، میں یہاں رہنے کے بجائے حلیف
اسی لئے بنا تھا کہ اپنا بوجھ ہلکا کر دوں۔ میں نہیں چاہتا کہ کل کلاں
کو مخزومی یہ چرچا کریں کہ ابو حذیفہ کے گھرانے میں ایک مہمان آکر
ٹھہرا تھا، اور جس طرح آیا تھا اسی طرح نہ کیا بلکہ کچھ لے ہی مرا۔"
ابو حذیفہ: "اچھا اگر چاہو تو اس سے تمہاری شادی کر دی جائے۔"
(نوجوان یہ بات سن کر ٹٹھٹھا مار کر منہستا ہے۔)

نوجوان: "مرحبا صدمرحبا، کیا تمہاری یہ خواہش ہے کہ میں تمہارے
لئے لونڈیاں اور غلام پیدا کرتا رہوں، شاباش، شاباش!"
ابو حذیفہ (نوجوان کے جواب سے خوش ہو کر اور اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر)

"عسلی نوجوان! خدا تجھے خوش رکھے، تو نے مجھے مجبور کر دیا، اچھا چاہا
 میں اس سے تیری شادی کیے دیتا ہوں، تیری اولاد جو اس سے
 پیدا ہوگی، آزاد ہے، اب تو خوش ہے!
 نوجوان: "شکریہ اور صد شکریہ، میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں،
 میں تو پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ آپ فخر مخزوم، زینت قریش اور عزت بطحا میں
 ابو حذیفہ (نوجوان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر) "بس کرو یا سمریس کرو، حد سے
 زیادہ تعریف کر چکے، تم آج ہی شام کو میرے پاس آ جانا، تمہاری
 شادی کر دوں گا، پھر بڑے شوق سے اپنی رفیق زندگی کے ساتھ آئے
 تھے گھر میں رہنا بہنا۔ امید ہے تمہارے گھر میں خیر و برکت ہوگی۔"

۲

مکہ میں ایک نیا انقلاب

خدا کی رحمت للعالمین پھانے والی ہے

گھڑی اب خیر و برکت کی جہاں میں آئی والی ہے

یاسر رفیق زندگی کو لے کر اپنے شے گھر میں منتقل ہو جاتا ہے اور

تالیخ ایک عرصہ دراز تک اُس سے خاموش ہو جاتی ہے۔ تالیخ کی یہ

ایک پرانی عادت ہے کہ وہ عوام کی طرف متوجہ نہیں ہوتی، خواہ وہ

زندہ ہوں یا مردہ، یا اُن پر کیسی ہی پتیا پڑ جائے۔ بھلا تالیخ ایسے

نوجوان کا کیا خیال کرے جس کا ایک ادنیٰ طبقہ سے تعلق ہے، جو

قریشیوں میں بھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا، اور مکہ میں بھی

معمولی حیثیت کا ایک انسان ہے۔ جو صرف مخروم کا ایک پردیسی

حلیف ہے، اور اپنے جیسے پست طبقے اور معمولی لوگوں کی طرح

زندگی گزار رہا ہے۔ جو بچا رہے دن رات خون پسینہ ایک کیے

اور محنت مزدوری کیے چند پیسے کماتے ہیں، اور اُن سے اپنا گزارہ

کہتے ہیں۔ اگر انھیں کسی روز محنت مزدوری نہیں ملتی تو اپنے اپنے
 حلیفوں کے پاس جا کر کچھ مانگ لاتے ہیں اور اپنی ضروریات پوری
 کر لیتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ امن و چین کی زندگی بسر کرتے ہیں،
 ان کے جان اور مال محفوظ ہیں، جو کچھ میسر آجاتا ہے اسی پر قناعت
 کر لیتے ہیں، نہ کوئی انھیں ستاتا ہے اور نہ کوئی ان پر زیادتی کرتا ہے،
 تاریخ اپنی پوری روایات کے مطابق اس زمانے میں بھی بڑی آن بان
 رکھتی ہے، صرف رئیسوں اور چودھریوں کی پرواہ کرتی ہے، اور بڑے
 بڑے لیڈروں اور کرداروں کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ تاریخ آج بھی
 ہمیشہ کی طرح بخیل، مغرور اور خود پسند ہے، اس کا تو یہ حال ہے
 کہ امراد اور رؤساء کی طرف بھی ذرا مشکل سے دیکھتی ہے، اور ان
 سرداروں کے وہی کام محفوظ رکھتی ہے جو اپنے اندر کوئی نمایاں عظمت
 و شان رکھتے ہوں، ورنہ دوسری باتوں کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتی۔
 اس بٹی کا یہ ثبوت ہے کہ تاریخ نے قریش کے اس زمانے کے واقعات
 قلمبند ہی نہیں کیے۔ البتہ ان کی زندگی کے چند گوشوں پر روشنی
 ڈالی ہے، جن سے ہمیں ان کے حالات کا پوری طرح علم نہیں ہوتا۔
 گویا وہ انھیں حقیر و معمولی سمجھ کر ان سے بے اعتنائی برت رہی ہے۔
 گویا وہ قیصرہ و اکاسرہ کو اور ان کے لیڈروں اور سرداروں کو

اپنی توجہ کا پورا حقدار اور اہل سمجھتی ہے اور انہیں اس لائق جانتی ہے کہ ان کے پاس پھرے ان کے حالات کا کھوج لگائے اور ان کے واقعات کو تفصیل وار ضبط تحریر میں لائے۔ یہ قریشی سردار جو عرب کے ان قبیلوں کے راہنما ہیں، جو لکھنا پڑھنا اور حساب و کتاب نہیں جانتے۔ نہ زمانے کو اور نہ دنیا کو اپنا مسخر بنا سکتے ہیں، نہ تاج و تخت کے مالک ہیں، بیچارے جوں توں کر کے اپنی زندگی کے ایام بسر کر رہے ہیں۔

جب قریشیوں کے راہ نما تاریخ کی نگاہ میں قابلِ عزت نہیں، کہ ان کی باتیں ضبط تحریر میں لائی جاسکیں، بجز ان چند باتوں کے جو آئندہ نسلوں کے لئے دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہوں، یا ان کے دل بہلا سکتی ہوں، اور ان کا غم غلط کر سکتی ہوں۔ تو اس قوم کے عوام کا تو ذکر ہی کیا ہے، جن کے پاس نہ دولت و ثروت ہے، نہ عزت و عظمت ہے، نہ حرفت و صنعت ہے نہ تجارت و زراعت ہے۔ نہ کوئی اقتدار و طاقت ہے، اور نہ بے چارے دیوتاؤں کے نگران ہیں۔ نہایت پست زندگی بسر کرتے ہیں، تنگدست و فاقہ مست ہیں اور بسا اوقات فیاض طبع امراء کے کاسہ لیس ہیں۔ یا سر بھی اسی پس ماندہ طبقے سے تعلق رکھتا ہے، اسی لئے تاریخ کو اس کی پروا نہیں

اور نہ وہ اس کی طویل زندگی کی ساتھی ہے۔ یا سہرے صبح صبح روزی کی تلاش میں نکلتا ہے اور شام کو اپنی کمائی لے کر گھر میں آجاتا ہے۔ تاریخ نہ اس کی صبح کو دیکھتی ہے اور نہ شام کو آخر کار رفتہ رفتہ وہ مبارک دن بھی آپہنچتا ہے جس دن تاریخ اپنی بے اعتنائی کی عادت چھوڑنے پر مجبور کر دی گئی۔ آج وہ جس قدر گہری دلچسپی معمولی طبقے کے لوگوں سے لے رہی ہے پہلے اتنی دلچسپی سرداروں اور پیشواؤں سے بھی نہیں لیتی تھی۔ آج تاریخ اس بات پر مجبور ہے کہ وہ یا سر اور یا سر جیسے دیگر عوام کی خیر خیر لے، اور ان کے حالات اس قدر تفصیل سے ضبط تحریر میں لائے جو تفصیل قریشی سرداروں اور مخرومی رئیسوں کے حالات کے بارے میں بھی نہ آئی ہو۔ جب تاریخ نے ادھر دیکھا تو اسے بہت ہی معمولی سے واقعات رونما ہوتے نظر آئے، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ لوگ ان کی طرف متوجہ بھی نہ ہونگے لیکن جیسے ہی یہ واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں، انہیں دیکھ کر دل دھڑکنے لگا، خیالات میں بہجان پیدا ہو گیا اور عقلیں جاگ اٹھیں۔ آج پس ماندہ اور معمولی طبقے کے انسان کو بھی اپنی شخصیت کا احساس ہونے لگا۔ وہ بھی اپنے حقوق پہچاننے لگے، اور انہیں حاصل کرنے میں سرگرم عمل نظر آنے لگے، وہ اس راہ میں مستی کو حائل نہیں

ہونے دیتے، رفتہ رفتہ نتیجہ ایک انقلاب کی صورت میں نمودار ہو جاتا ہے۔ اور قریشی سرداروں کو ہر چیز بدلی بدلی سی نظر آتی ہے۔ غلاموں کی ذہنیت بدل گئی، بیکسوں اور فاقہ مستوں کے خیالات بدل گئے، نادار ان پیروں کی آرزو کرنے لگے، جن کی انہیں ہوا بھی نہ لگی تھی، پس ماندہ طبقہ ان کاموں پر پل پڑا جن کا قریشیوں کو وہم و گمان بھی نہ تھا، اور مظلوم و بے بس انسان ایسی باتیں کرنے لگے جن سے واقف نہ تھے۔ غلام آزادی کے حریف ہیں، خود مختاری کے مشتاق ہیں، عزت و عظمت کو لالچ بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں، پست طبقہ کی گفتگو سے معام ہوتا ہے کہ وہ حقوق زندگی میں سرداروں سے کم نہیں، احترام و اکرام کے وہ بھی حقدار ہیں، مضررت رسا کاموں سے بچنا ان کا بھی فرض ہے۔ ان باتوں سے انہیں بھی اجتناب ضروری ہے، جو قومی وقار کو ملیا میٹ کر دیں، اور باعث تنگ و عار ہوں۔

ہر شخص مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور مٹی ہی میں بلجائے گا سب کا آغاز و انجام یکساں ہے اگر تفاوت ہے تو زندگی میں یہ تفاوت بھی ان کے دلوں، ضمیروں اور خیالات میں ہے۔

اور وہ بھی اس لحاظ سے کہ کون نیکیوں کا دلدادہ، برائیوں سے
تنتفر، گناہوں سے بیزار اور بھلائیوں کی طرف راغب ہے، اور
کون نہیں۔ بس بھلائی برائی انسان میں فرق پیدا کرتی ہے، اور
کوئی چیز انسان کو انسان سے جدا نہیں کرتی، عوام کی گفتگو سے
معاوم ہوتا ہے کہ انسان کا دل، روح اور ضمیر مرنے کے بعد
بھی صرف جزا و سزا میں ایک دوسرے سے جدا ہے۔ جس
نے رائی کے دانے کے برابر نیکی کی ہوگی اُس کی جزا ضرور
اُسے مل جائے گی، اور جس نے رائی کے دانے کے برابر بدی
کی ہوگی اُسے اُس کی سزا سے ضرور سابقہ پڑے گا۔ کسی آزاد کو
محض اُس کی آزادی کی بدولت کسی غلام پر کوئی فو قیت نہیں،
البتہ اگر وہ ایمان والا، پارسا اور نیک عمل والا ہوگا، تو اُسے
بے ایمان، فاسق و فاجر غلام پر ضرور فضیلت حاصل ہوگی،
لوگوں کو اپنے دل سے اپنی زبان سے اور اپنے ہاتھ سے
نہ ستانے والا غلام اس آزاد سے بہتر ہے جس میں ساری
خرابیاں موجود ہوں، ایمان و تقویٰ والا غلام جس کا دل
گناہوں سے، روح ہر قسم کی بدی سے، اور خیالات ہر طرح
کی گندگی سے پاک و بے داغ ہوں وہ اس آزاد سے ہزار درجہ

بہتر ہے جس کی آزادی کو ان برائیوں نے داغدار بنا دیا ہے۔
 عوام میں یہ بحث بھی چھڑی رہتی تھی کہ آزادی اور غلامی،
 فراخی اور تنگدستی، اور طاقت و بے بسی سب چلتی پھرتی چھاؤں
 ہے، آتی جاتی رہتی ہیں۔ یہ مخصوص عواہن ہرگز ہرگز فیصلت کے
 اسباب نہیں بن سکتے۔ ان سے نہ کوئی سرکاری کے قابل ہوتا
 ہے اور نہ حکومت کے لائق، اگر کسی کو کسی پر فوقیت ہے تو
 وہ محض بھلائی، نیکی اور پارسائی سے ہے

اگر کسی کو سرکاری یا حکومت ملتی ہے تو وہ صرف
 اس اقتدار کی بدولت ملتی ہے، جو دہانے میں
 نہیں ملتا نہ دولت و ریاست سے حاصل ہوتا ہے، بلکہ عوام
 کی خوشنودی اور اعتماد و بھروسے سے حاصل ہوتا ہے کسی
 کی ہر دلچیزی اس کی صلاحیت اور اس کی استعداد سے لوگ
 اسے یہ رتبہ عطا کرتے ہیں۔ لوگوں پر حکومت اس آئین و قوانین
 کے ذریعہ کی جاتی ہے جو ان کے پاس آسمان سے اترتا ہے،
 جس میں بھلائی کو برائی سے، معروف کو منکر سے، اور حلال کو
 حرام سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ قومی رسم و رواج پر باپ دادا
 کی رسموں پر یا اکابر کے دستور پر حکومت نہیں چلائی جاتی۔

یہ تھے وہ حیرت انگیز خیالات جو اُس دور کے فلاسوفوں، سیکسوں اور ناداروں میں پائے جاتے تھے۔

جب یہ لوگ آپس میں ملتے یا فارغ ہو کر بیٹھتے تو اُن کا موضوع بحث یہی ہوتا۔ عموماً ان ہی باتوں کو بیان کیا جاتا، انہیں پر تبادلہ خیالات ہوتا، اُسی تحریک کو چلایا جاتا، اور انتہائی انتہاک و مصروفیت سے انہیں پاکیزہ خیالات کو ذہنوں میں اتارا جاتا یہی وہ انقلاب تھا جس نے قریشی سرداروں کو بے چین بنا رکھا تھا، جس سے اُن کی آتش غیظ و غضب بھڑک اُٹھی تھی، جب پانی سر سے اتر جاتا ہے تو اکابر قریش غصہ سے بے قابو ہو کر پکا ارادہ کر لیتے ہیں کہ آگ لگنے سے پیشتر اس خطرناک شعلے کو جھا کر رہیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی لپٹیں دور دور تک پھیل کر لوگوں کے دلوں کو جلا کر بھسم کر ڈالیں۔

جس دن تاریخ نے جھانک کر مکہ کی گلیوں کو دیکھا تو وہاں جگہ جگہ یہی انقلاب دکھائی دیا، لوگوں کے دلوں میں انقلاب ذہنوں میں انقلاب، خیالات میں انقلاب اور روایات میں انقلاب آخر تاریخ نے بھی خوش ہو کر نعرہ لگایا، انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد۔ آج مکہ کی پُرامن فضا انقلاب کے نعروں سے گونج

اٹھی ہے، پھر تاریخ دوڑ کر عیسیٰ نوجوان اور حبشی دو شیزہ کے پاس جاتی ہے، اور نوجوان یاسر اور اُس کی رفیقہ حیات سمیہ کو زندگی کی آخری منزل میں دیکھتی ہے۔ یاسر کا حلیف ابو حذیفہ دنیا کو چھوڑ چکا ہے۔ سمیہ کے تین بیٹے ہیں جن میں سے ایک تو کسی نامعلوم حادثہ کا شکار ہو چکا ہے، اور دو ماں باپ کے ساتھ آرام سے رہتے سہتے ہیں؛ اور اپنے والدین کی طرح گنہگار کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ تاریخ نے نہ یاسر کو چھووا اور نہ یاسر کے بیٹوں کو، بلکہ ایک روز مکہ کی گلیوں میں انقلاب کا قریب سے تماشہ دیکھنے کے لئے پہنچ جاتی ہے۔ جب مسجد میں پہنچتی ہے تو قریشیوں کی بیٹھکوں کو بڑا گرم دیکھتی ہے، کان لگا کر سنتی ہے تو تمام بیٹھکوں میں انقلاب کا شور و ہنگامہ سنائی دیتا ہے۔ سارے قریشی محمدؐ، آپ کی دعوت اور آپ کی تحریک کے متعلق باتوں میں منہمک ہیں۔ قریشیوں کی ان بیٹھکوں میں بڑی گرم گرم بحثیں ہو رہی ہیں۔ ہر جگہ محمدؐ، ان کی دعوت اور ان کے کمزور اور غلام ساتھیوں کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے، کبھی کبھی ارقم کے گھر کا بھی ذکر چھڑ جاتا ہے، جو نئی تحریک کا مرکز ہے، جہاں سے انقلاب کے شعلے اُٹھتے نظر آ رہے ہیں اور جس جگہ

سے ڈرتے ڈرتے یہ دعوت پھیلائی جا رہی ہے، تاریخ ان سنگار
 پسند بیٹھکوں کو چھوڑ کر ارقم کے گھر جا پہنچتی ہے تاکہ قریب سے
 محمد صلعم کو اور ان کے کمزور ساتھیوں کو دیکھ لے۔ جب وہاں
 پہنچتی ہے تو دروازے پر دو اجنبی کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔
 ایک شخص سیاہ فام اور لمبا ترنگا ہے جس کا قد آسمان سے باتیں
 کر رہا ہے، اور دوسرا شخص سرخ و سفید، گورا چٹا اور درمیانی
 قد والا ہے۔ تاریخ ان کے پاس باتیں سننے کے لئے کھڑی ہو جاتی
 ہے، سیاہ فام گورے سے پوچھتا ہے :-

سیاہ فام :- کیسے تشریف لائے ؟
 گورا :- جناب کا کیسے آنا ہوا ؟

سیاہ فام :- میں تو محمد کے پاس آیا ہوں، تاکہ ان کی باتیں سنوں
 اور ان سے تعارف حاصل کروں۔

گورا :- میں بھی اسی غرض سے آیا ہوں۔

آخر دونوں شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کرتے
 ہیں، آپ کی پیاری پیاری اور مشفقانہ باتیں سنتے ہیں اور
 مسلمان ہو جاتے ہیں۔ تاریخ غور سے دیکھتی ہے، سیاہ فام عمار
 بن یاسر ہیں اور گورے صہیب بن سنان ہیں۔ اس دن

سے تاریخ نوجوان عسی کو بھی یاد کرتی ہے، لیکن اس کے بیٹے
عمار کے پیچھے پیچھے تو قدم بد قدم چل رہی ہے۔

٢٠

ایک خطرناک خواب

کبھی خواب میں جو وہ آگے مجھے اپنا جلوہ دکھا گئے
مرے دل سے بوجھ اٹھا گئے مے دل سے غم کو ہٹا گئے

بڑھاپا بڑا زمانہ ہوتا ہے۔ اب یا سمر عمر کی اس منزل میں
پہنچ چکا ہے جہاں پہنچ کر انسان کے قومی میں اعتدال، اعضاء
میں توانائی اور امیدوں میں حرارت نہیں رہتی، عقل بہک جاتی
ہے، مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے اور خیالات پراگندہ
ہو جاتے ہیں۔ یا سمر بھی دوسرے لوگوں کی طرح ان عوارض کا
شکار ہے۔ بعض دفعہ تو خود اپنی ذات سے نفرت سی ہو جاتی
ہے، سمیٹنے کے بھی کچھ تیور بدلے بدلے سے نظر آتے ہیں، کیونکہ وہ
بھی یا سمر کی عادتوں سے نالاں ہے۔ یا سمر کی ہمیشہ عادت تھی
کہ مکہ کے خشک پہاڑوں اور پتھریلی وادیوں میں سو بچ کی
کریں پڑنے سے پہلے وہ بیدار ہو جاتا تھا، پھر نہ تو خود سوتا اور

نہ کسی کو سونے دیتا۔ بلکہ تیز قدموں سے گھر میں ادھر سے ادھر
 ٹہلتا رہتا، کسی جگہ آرام و سکون سے نہیں بیٹھتا تھا۔ پھر سونے
 پر سہاگہ یہ کہ خود بخود زور زور سے بولتا اور چیخ چیخ کر دیوالوں
 کی طرح خود بخود باتیں کرتا رہتا۔ یا سر کی یہ حرکتیں گھروالوں کو
 نہ بھاتی تھیں۔ وہ ان سے بڑے پریشان اور منہموم رہتے، دل
 ہی دل میں یا سر کو برا بھلا کہتے، بلکہ کبھی کبھی تو زبان سے بھی
 ناراضگی کا اظہار کر دیتے تھے، اور خاموشی اور سکون سے بیٹھ جانے
 کی درخواست کرتے تھے۔ لیکن یا سر ان کی بات نہ مانتا اٹان کا
 مذاق اٹاتا اور انہیں بے وقوف و پاگل بناتا، بلکہ ضد میں آکر اور
 ہنگامہ برپا کر دیتا، اور گھر میں آتا جاتا رہتا، پھر انہیں شرم و
 غیرت دلاتا اور مذاق مذاق میں ان پر طعن و تشنیع کرتا تاکہ یہ لوگ
 یا تو جبریہ جاگ ہی جائیں ورنہ کم از کم ان کی نیند تو ضرور اچاٹ
 ہو ہی جائے گی۔ یا سر کی بیوی سمیہ کو یا سر کی ان حرکتوں سے
 بڑا شکوہ تھا اور اس کی بے سود گفتگو سے اور غیر مناسب جملہ قومی
 سے وہ انتہائی متعزب تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ جہاں تک ممکن ہو
 دیر میں اٹھا جائے کیونکہ اٹھ کر اسے گھر کے کام کاج میں لگنا
 پڑے گا، اور محنت و مشقت کرنی پڑے گی جس سے وہ لاغر

وخیف ہو گئی تھی، اسی خیال سے غریب دہریوں میں اٹھنا پسند کرتی تھی۔ مگر یہ بوڑھا بکواسی اس سے زیادہ کسی چیز کو ناپسند نہ کرتا تھا کہ وہ تو بیدار ہو اور دوسرے اس کے ساتھ پڑے سوتے رہیں۔ یہ چیز اُس کے لئے سوہانِ روح تھی، اُسے کسی طرح چین ہی نہ آتا جب تک وہ سونے والوں کو جگانہ لیتا اور وہ اُس کی بے فائدہ باتوں میں لگ نہ جاتے جو کبھی ختم ہی نہ ہوتیں۔ قہر درویش بجان درویش، بیچاروں کو سُننے بغیر چارہ ہی نہ تھا، ہوں ہاں کرتے رہتے تھے، لیکن جواب نہ دیتے تھے۔ یا سمر کی باتیں بڑی رنگین، بڑی لچھے دار اور بڑی دلچسپ ہوتی تھیں۔ ان کی لطافت و غرابت کا یہ عالم تھا کہ سُننے والوں کی طبیعت ذرا نہ اُکتاتی، بلکہ اور سُننے کا شوق بڑھتا ہی رہتا، کیونکہ وہ اپنے پرانے وطن تہامہ میں کے عجیب عجیب قصے سنایا کرتا تھا، اور اپنے دور دراز کی سیاحت کے نئے نئے دلائل و براہین بتایا کرتا تھا، جو اُس نے تجارتی سلسلے میں مخزومیوں کے ساتھ شام عراق اور دیگر ممالک کے دوران سفر میں کی تھی۔ قریشیوں کے مناقب و معائب اور فضائل و زواہل یا سمر سے زیادہ کسی کو معلوم نہ تھے، اور نہ کوئی قریشی سرداروں

اور لیڈروں کے بارے میں اس قدر تفصیل سے گفتگو کرتا تھا
 یا سران سرداروں کی تعریف و توصیف میں بھی رطب اللسان
 رہتا، مگر ان پر کڑی تنقید بھی کرتا تھا، وہ خوب کھل کر ان کی
 بُرائیاں بھی بیان کرتا تھا جس سے اُس کے اہل و عیال کی
 خواہش بھڑک اُٹھتی تھی، اور وہ یہ باتیں بڑے شوق و ذوق
 سے سنتے تھے۔ عوام کو اس پیر سے بڑھکر اور کیا چیز محبوب ہوگی
 کہ وہ اُمراء اور رؤساء کے اچھے بُرے حالات سنتے رہیں۔ یا سر
 جب قریشیوں کے بارے میں گفتگو کرتا تو کچھ اس پیارے انداز
 سے بیان کرتا تھا کہ اپنے مخاطبین کے دل موہ لیتا تھا۔

سمیہ کو قطعی یقین تھا کہ جب تک کافی دن نہ چڑھ جائے گا
 یا سر گھر سے باہر نہ نکلے گا۔ لیکن آج جب وہ نیند سے بیدار ہوا
 تو خلاف معمول اپنے بستر سے نہیں اُٹھا، نہ آج حسب دستور
 چھپا ہٹ سے، بالکل خاموش کم سُم بستر پر پڑا ہوا ہے، نہ چہل
 قدمی ہے نہ کوئی بات زبان سے نکالتا ہے نہ گھر والوں کو
 جگاتا ہے اور نہ اُنھیں باتوں میں لگاتا ہے۔ سمیہ موقع کو غنیمت
 سمجھ کر جی بھر کر سوئی ہے، اور جب اُس کی نیند پوری ہو جاتی ہے
 اور جاگ جاتی ہے تو یا سر کو خاموش بستر پر دراز دیکھتی ہے۔

یاسر کی غیر معمولی خاموشی اُسے نہیں بھاتی، سوچتی ہے کہ یہ خاموشی اور یہ سکون کیسا۔ یہ تو یاسر کی عادت کے خلاف بلکہ ہے۔ آخر گھبرا جاتی ہے، بناوٹی مسکراہٹ کا اظہار کرتی ہے لیکن دل میں گھبراہٹ، بے چلتی اور خوف کے لمبے لمبے جذبہات موجزن ہیں۔ ستمیہ (جھک کر): کیا حال ہے، مزاج تو ٹھیک ہے، کچھ تکلیف تو نہیں یا سر؟

یاسر (انتہائی دھیمی آواز سے) نہیں، کوئی بات نہیں، بالکل ٹھیک ہوں!

ستمیہ: پھر کیا بات ہے، آج تمہارا شور و شر کہاں گیا؟ گھر سونا پڑا ہوا ہے۔

مرگیا بیمار تیرا کیا کہ ہنگامہ نہیں

گھر سے سونا سونا دل میں درد کیوں پیدا ہوا

یاسر: (حیران ہو کر) شاباش ستمیہ شاباش! تیری فرمائش بھی عجیب

وغیب ہے، تجھے کسی طرح چین نہیں، آخر بتا تو سہی تجھے کس طرح

خوش رکھوں، اگر ہنسی مذاق کرتا ہوں تو کہنے لگتی ہے میری

نیند اچاٹ ہو گئی، اور اگر خاموش پڑا رہتا ہوں تو کہتی ہے،

آج گھر سونا سونا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ مجھے خاموشی بالکل

پسند نہیں اور نہ میں تمہاری خاطر خاموش لیٹا ہوا ہوں، بلکہ
میں نے ایک ہولناک خواب دیکھا ہے جس نے میری زبان
بند کر دی اور خوش طبعی کی ساری باتیں بھلا دیں۔

یہ سن کر سمیہ کو ذرا اطمینان ہوا، اُس کی بے چینی دور ہوئی اور
اُس کا جھڑی دار چہرہ مسرت سے کھل گیا۔

سمیہ: (مسکرا کر) "خدا کرے تم اسی طرح روزانہ دہشت انگیز خواب
دیکھ لیا کرو جو تمہیں خاموش رکھے، تاکہ ہمارے آرام میں خلل نہ
آئے، جس کی ہمیں ضرورت ہے۔" (یہ سن کر یاسر مسکرا دیتا ہے،
باچھیں کھل جاتی ہیں، لیکن فوراً ہی بند ہو جاتی ہیں، اُس کا
چہرہ کھلتے ہی پژمردہ ہو جاتا ہے۔)

یاسر: (کمال سنجیدگی سے) "نہیں نہیں، سمیہ! یہ کوئی معمولی خواب نہیں
ہے، نہ پریشان خیال ہے، ضرور اس کی کوئی نہ کوئی غیر معمولی
تعبیر ہوگی۔ میں اکثر خواب دیکھتا رہتا ہوں لیکن بیدار ہوتے
ہی بھول جاتا ہوں، مگر اس خواب کا وہی نقشہ میری آنکھوں
کے سامنے ہے، وہی اثرات میرے دل و دماغ پر چھائے ہوئے
ہیں، اور وہی ساری باتیں مجھے یاد ہیں، کیا بتاؤں وہ منظر تو
میری آنکھوں سے ہٹتا ہی نہیں۔"

سمتیہ: (خوف زدہ ہو کر) آخر بتاؤ تو یہی کیا دیکھا، شاید کچھ اثرات کم ہو جائیں اور دل سے کچھ بوجھ ہٹ جائے۔
 یا سر ٹھنڈی آہ بھرتا ہے اور آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے
 پھر رُک رُک کر خواب سُنا تا ہے، ابھی تھوڑا ہی سا خواب بیان کیا ہو گا کہ سمتیہ خوف زدہ ہو جاتی ہے، اگر اُسے حیا دا منگیر ہوتی یا وہ ہمت ہار جاتی تو یا سر کو خواب سے روک دیتی لیکن دل مضبوط کر کے برابر سُنتی رہتی ہے۔

یا سر: میں تم سے اصل خواب بیان نہیں کرنے کا، البتہ اس ہولناک منظر کا ضرور خاکہ کھینچ دوں گا جو میری آنکھوں میں اب تک پھر رہا ہے۔ ایک وادی ہے چوہہ تو بہت چوڑی چکلی ہے، نہ بہت تنگ ہی ہے بلکہ درمیانی ہے، اس کے دو طرفہ پہاڑ ہیں جو سر ^{بفلک} ہیں، اور ان کی چوٹیاں اتنی بلند ہیں کہ ان تک نگاہ نہیں جاتی، دیکھتے ہی دیکھتے دونوں پہاڑ جگہ جگہ سے پھٹ جاتے ہیں، اور ان میں لا تعداد گہری گہری ڈراڑھیں پڑ جاتی ہیں، ان ڈراڑھوں سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں جو آپس میں ایک دوسرے کی طرف لپک لپک کر جا رہے ہیں۔ آخر تمام شعلے مل جاتے ہیں، اور تمام وادی میں پانی کی طرح شعلے ہی شعلے بھڑکتے نظر

آتے ہیں۔ اس وادی کے سامنے ایک سرسبز و شاداب اور ہر بھرا
 سبزہ زار ہے جہاں ٹھنڈے اور میٹھے پانی کی نہریں بہ رہی ہیں
 آگ کی خوفناک لپٹیں اس سبزہ زار تک نہیں پہنچتیں، بلکہ
 ان کے قریب پہنچ کر ٹھہر جاتی ہیں۔ میں اس ٹھنڈی اور ہری
 بھری جگہ میں تم کو کھڑا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے
 جیسے تمہاری جوانی لوٹ آئی ہے تمہارا چہرہ ماہِ نیم ماہ کی طرح
 دمک رہا ہے، تم مسکرا رہی ہو، مجھے نگاہوں اور اشاروں سے
 بتا رہی ہو اور آواز بھی دے رہی ہو۔ میرے پیچھے عمار کھڑا ہو
 اور محبت بھرے لہجہ میں مجھ سے کہہ رہا ہے: "ابا جان! آگے
 بڑھیے تو سہی آپ کا بال بھی بیکاتا ہوگا، یہ تو محض چند چنگاریاں ہیں
 زیادہ سے زیادہ دو چار چھالے پڑ جائیں گے، ذرا سامنے نظر اٹھا کر
 تو دیکھیے کیسا دل پسند سبزہ زار ہے، دیکھیے وہ... وہ اتنی جان
 کھڑی رہیں اور جوان ہو گئی ہیں، وہ دیکھئے اشاروں سے
 آپ کو بتا رہی ہیں، دیکھیے آپ کو پکار رہی ہیں، آپ کی جوانی بھی
 آپ کی نظر ہے، آہ! ادھر عمار مجھے آگے بڑھا رہا تھا اور ادھر
 میں تمہارے بلانے کی آواز سن رہا تھا۔ آخر میں آگ میں گھس جانے
 کا ارادہ کر رہا ہوں، لیکن اس کی خوفناک لپٹوں سے میری

آئینہ کھل جاتی ہے۔“

یہ کہہ کر یا سر ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرنے لگتا ہے اور اپنا سر پیٹنے لگتا ہے۔ کہتا ہے ہائے ہائے اب تک مجھے وہ لپٹیں یاد ہیں مجھے ایسا معام ہوا ہے جیسے میرے جسم میں شعلے بھڑک رہے ہوں، اب تک میرے جوڑے جوڑے میں سوزش ہے، سمیٹے اپنے بوڑھے شوہر کی بوکھلاہٹ دیکھ کر ٹرپ جاتی ہے، اور بے صبری سے دردناک لہجے میں عرض کرتی ہے۔

سمیٹ: ”فکر نہ کرو، خدا تمہارا مددگار ہے، کوئی اندیشے کی بات نہیں، اٹھو اور ناشتہ کر لو، پھر کسی کاہن سے جا کر اپنا یہ ہولناک خواب بیان کرنا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی تعبیر بتا دے۔“ (اس خواب والے دن کی ابھی شام بھی نہ آئی تھی کہ خواب نے اپنی تعبیر آپ بتا دی اور یا سر کے جسم پر آگ کی لپٹوں کی سوزش بھی نمودار ہو گئی۔



غیر عادلانہ مطالبہ

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھرنے آئے کیوں
 روئیں گے ہم ہزارہ باز، کوئی ہمیں ستائے کیوں

یاسر خواب سنا کر بیت اللہ چلا جاتا ہے اور مخزومیوں کی
 پیٹھک میں پہنچ کر سلام کر کے مؤدب بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن آج
 لوگ اسے کچھ بدلے بدلے سے نظر آ رہے ہیں۔ حسب دستور
 اسے دیکھ کر کسی کا چہرہ شگفتہ نہیں ہوتا، نہ کوئی اسے بلند آواز
 میں سلام کا جواب دیتا ہے، البتہ کوئی دبی زبان سے مردہ
 آواز میں اس کے سلام کا جواب دیدیتا ہے۔ باقی دیگر حضرات
 اپنی اپنی باتوں میں مصروف ہیں گویا انھیں نواز کی پرواہ
 ہی نہیں۔ یاسر ان کی اس بے اعتنائی پر دل ہی دل میں
 گڑھتا ہے لیکن اس کا اثر اس کے دل پر دیر تک نہیں رہتا
 کیونکہ اسے معلوم ہے کہ مخزومی بڑے مغرور، بڑے متکبر اور

بڑے خود پسند ہیں۔ اُن کی گھٹی میں فخر و گھمنڈ ہے، شاید آج
 بھی اُنہوں نے اپنی فطرت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اگر یاسر کو
 ابو خذیفہ سے کئے ہوئے معاہدہ کا خیال نہ ہوتا تو وہ کبھی
 کسی قریشی قبیلہ سے جا ملا ہوتا، لیکن اس کی شرافت کا
 یہ تقاضا نہ تھا کہ زندگی میں تو ابو خذیفہ سے وفا کرتا رہا، اور
 اس کے مرنے کے بعد عہد شکنی پر اتر آتا، اسے معاہدے کی
 پابندی کرنی پڑ رہی تھی، کیونکہ ابو خذیفہ ہی نے تو اُسے
 وقت اُس کی مدد کی تھی، وہی تو پریشانی کے بعد اُس کا
 پشت پناہ بنا تھا، اور اسی کا سب سے بڑھ چڑھ کر یہ احسان
 تھا کہ سمیٹے کا اسے مالک بنا دیا تھا جو اسے سب سے زیادہ
 محبوب تھی، اس کا یہ احسان کیا تھوڑا تھا کہ اُس نے اس کی
 اولاد کو پیدا ہونے سے پہلے ہی آزاد کر دیا تھا۔ پھر اس کا
 ساوک ملاحظہ ہو کہ اپنے مرنے سے پہلے ہی اس کی رفیقہ
 حیات کو بھی آزاد کر دیا تھا۔ اب یاسر کا پورا خاندان ایک آزاد
 خاندان تھا، جبکہ اس سے پہلے نصف خاندان آزاد تھا اور
 نصف غلام۔ یاسر اپنا ہولناک خواب سنانے کی عرض سے مزو میو
 کی بیٹھک میں آتا ہے تاکہ اگر ایک طرف انہیں یہ خواب حیرت و

دبچسی کا سامان فراہم کر دے گا، تو دوسری طرف شانزدہ خواب کی تعبیر بھی بتا سکیں گے۔ لیکن جب وہ مخرومیوں کی سرد مہری اور بے اعتنائی دیکھتا ہے تو خواب بیان نہیں کرتا بلکہ چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ مجال ہے کہ زبان سے ایک لفظ بھی نکالے۔ مخرومیوں کی تو یہ ایک پرانی عادت تھی کہ وہ جب یا سر کو کسی مجلس میں یا گھر میں دیکھتے تو اس کے ساتھ ہنسی مذاق اور دل لگی کی باتیں کرنے لگتے تھے، اور اُس کی دبچسپ و حیرت انگیز باتیں سُننے کے لئے اُسے اکسا دیا کرتے تھے۔ لیکن آج کی بے رخی یہ بتا رہی ہے گویا وہ اسے جانتے بھی نہیں بلکہ اس سے بیزار اور متنفر معلوم ہو رہے ہیں، وہ نہ تو خود اُس سے باتیں کرتے ہیں اور نہ اُسے باتیں کرنے دیتے ہیں۔ یا سر پہلے ہی سے اس بات کا عادی تھا کہ وہ ان نخوت پسندوں میں چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ جب یہ اپنی باتوں سے فارغ ہوتے تو خود ہی اُس کی طرف متوجہ ہو جاتے پھر اُسے موقع ملتا کہ وہ دل کھول کر اُن کے غور کا مذاق اڑاتا، اور ہنس ہنس کر ایسی کھری کھری باتیں سُنا دیتا جو انہیں اچھی معلوم نہ ہوتیں۔ اگر وہ اس چیز کا عادی نہ ہوتا تو کبھی کسی قریشی قبیلے سے جا ملتا لیکن محض اپنی عادت اور تحمل کی بدولت

وہ اُن کے پاس اس خیال سے دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا کہ
 اُن کی بد اخلاقی کا ان سے ضرور انتقام لینا چاہیے۔ آخر انتظار
 کی گھڑیاں جلد ہی ختم ہو جاتی ہیں، اور کوئی اس سے بات چھیڑ
 دیتا ہے۔ یہ عمرو بن ہشام ہے جو اچانک یاسر سے پوچھ رہا ہے:-
 عمرو بن ہشام: یاسر! آج دیر سے کیوں آئے؟
 یاسر (مذاقہ انداز میں): کوئی نہ کوئی بات تو ضرور ہوگی ہی جو مجھے
 اتنی دیر ہو گئی، ابوا حکم!

عمرو: (غصہ کو ضبط کرتے ہوئے) مجھے تیری تلاش تھی، تجھ سے ایک
 بات پوچھنی ہے جو اب تک میری سمجھ میں نہ آ سکی۔
 یاسر: کیا بات ہے؟

عمرو: میں نے کبھی تجھے اپنے دیوتاؤں کے پاس نہیں دیکھا،
 اور تیرے منہ سے اُن کی بڑائی نہیں سنی؟
 یاسر: رہنس کہہ کیا آپ نے کبھی میری زبان سے اُن کی بڑائی
 سنی؟ یا آپ نے کوئی کام ایسا دیکھا جس سے دیوتاؤں کی توہین
 ہوتی ہو؟

عمرو: خیر! وہ ہمارے ہی دیوتا ہیں نا، میں تیرا ان سے کوئی تعلق
 نہیں رکھتا۔

پاسر: آپ کا مطلب؟

عمر و: (غصہ سے سرخ ہو کر گرفت آواز میں) ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کون ہمارے ساتھ ہے اور کون ہمارا مخالف ہے، اب وہ وقت آ پہنچا ہے کہ ہر مکی اپنا عقیدہ صاف صاف بیان کر دے اور دل کی بات ظاہر کر دے۔ ہم نے آج تک اپنے حلیوں سے بہت نرمی برتی اور ہمیشہ ان سے درگزر کرتے رہے، لیکن اب ان سے رعایت نہیں کی جائیگی۔

پاسر: ابوا حکم ذرا سوچ سمجھا کر بات کیجئے، جب سے میں نے آپ کے چچا ابو حذیفہ سے معاہدہ کیا ہے آپ نے اور آپ کی قوم نے میری کوئی بُرائی نہیں دیکھی۔ لیکن اب میں تم لوگوں سے ایسی ایسی باتیں سن رہا ہوں جو آج تک حرمِ مکہ میں میں نے نہیں سُنیں۔
عمر و: (آنکھیں نکال کر) اچھا! اس معاہدے کی رو سے آج سے تو اپنے بیٹے عمار کا دشمن ہے۔ (یہ کہہ کر وہ ٹھٹھا مار کر ہنس پڑتا ہے لیکن اس کی ہنسی میں خوشی کی بہ نسبت غیظ و غضب کی جھلک زیادہ موجود ہے۔)

پاسر: آپ کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی، ذرا کھول کر بیان کیجئے۔

عمرو: کیا تجھے معلوم نہیں کہ کل سے تیرا بیٹا بے دین ہو گیا ہے اور
 محمد اور اس کے ساتھیوں کو مانتے لگا ہے۔
 یہ بات سن کر یاسر ایک ہتھیار تاج مارتا ہے اور غش کھا کر زمین پر گر
 پڑتا ہے، ہوش و حواس کھو جاتے ہیں زبان بند ہو جاتی ہے، چہرہ
 لہو پڑ جاتا ہے، پیشانی سے پسینہ بہنے لگتا ہے، اور پوڑھے یا سر
 کی قابل رحم حالت ہو جاتی ہے۔ مخزومی سردار ایک دوسرے کی
 طرف متوجہ انداز میں دیکھنے لگتے ہیں۔ عمرو اس بیچارے سے کچھ
 کہتا ہی چاہتا ہے کہ جھٹ اس کا چچا ولید بن میسرہ بول پڑتا ہے۔
 ولید: "بھئیے! بس کر، اس پوڑھے حلیف پر رحم کھا، دیکھتا نہیں
 غریب کی جان پر کیا بن رہی ہے۔ بیٹے کے گناہوں کا باپ ذمہ دار
 نہیں ہوتا، خصوصاً اس صورت میں جبکہ بیٹا چالیس سے اوپر ہو چکا
 ہے، دوسرے مخزومی سردار بھی ابو جہل سے یہی کہتے لگتے ہیں، اور
 ولید کی ہال میں ہال ملانے لگتے ہیں۔ اس عرصہ میں آہستہ آہستہ
 یاسر کے حواس درست ہونے لگتے ہیں۔ ہوش میں آکر وہ دیکھتا ہے
 کہ سب خاموش اور فکر مند بیٹھے ہیں۔ آخر خود عمرو سے مخاطب ہوتا ہے:
 یاسر: "ابو الحکم! بڑے افسوس کی بات ہے، آپ اپنے حلیف سے
 غیر اخلاقی برتاؤ کر رہے ہیں خدا کی قسم! میں نے تو عمار کو کل سے دیکھا

بھی نہیں، مجھے معلوم نہیں کہ اُس کا کل سے اب تک کیا حال
 رہا، میری تو اب تک اُس سے ملاقات ہی نہ ہو سکی، آپ
 بے موقع سختی کر رہے ہیں اور بے محل بات کر رہے ہیں، آپ
 کا بُرا بھلا کہتا غیر مناسب ہے، آپ طعن و تشنیع کے وقت
 یہ نہیں دیکھتے کہ میرا کوئی قصور بھی ہے کہ نہیں، آپ انصاف
 سے ہٹ کر بات کرتے ہیں اور کمزور پر طاقت آزمائی کرتے ہیں۔
 اگر آپ کے پاس انصاف ہوتا تو آرم سے انتقام لیتے، اُس پر
 تو آپ کا زور نہیں چلا اور مجھ پر دیسی کے پیچھے پڑ گئے۔ اگر عمار
 بے دین ہو گیا تو اس سے پہلے تو آرم بے دین ہوا تھا جو تمہاری
 طرح ایک سردار ہے۔ اُس کا گھر محمد (صلعم) کی تحریک کا مرکز بنا
 ہوا ہے، جہاں سے انقلاب کی پٹھیں نکل نکل کر مکہ کی گلی گلی
 میں پھیل رہی ہیں۔ اسی مرکز سے اسلام کی نشر و اشاعت
 ہو رہی ہے اور جہاں دیوتاؤں کو بُرا بھلا کہا جاتا ہے، لیکن
 آپ یہ خیال کر کے آرم سے ڈرتے ہیں کہ اگر اس کی نکسیر بھی
 پھوٹی تو اس کا خاندان آپ کا سر توڑ ڈالے گا اور ناک چنے
 جو ادے گا، لیکن آپ کے چچا ابو خدیفہ کا حلیف جو ایک پردیسی،
 بے یار و مددگار ہے، آپ اس کے خون سے ہاتھ رنگنے کو تیار ہیں

اگر آج ابو خلیفہ زندہ ہوتا تو میرے ساتھ اس بد اخلاقی سے
پہلے آپ خوب سوچ سمجھ لیتے۔

یا سر یہ کہہ کر ادا اس مغموم اور شکستہ دل گرتا پڑتا اٹھ کھڑا
ہوتا ہے، ایک گہرے فکر میں غرق اپنے گھر پہنچ جاتا ہے اور
اپنے پیچھے خزانوں کو ایک دوسرے سے لڑتا جھگڑتا چھوڑ
جاتا ہے۔



نئے انقلاب کی برکتیں

ڈرتا نہیں دنیا میں مسلمان کسی سے
 مل جاتی ہے جب دولتِ ایمان نبی سے
 یا سر جیسے ہی گھر ہو بچ کر دروازے میں گھستا ہے تو گھر کی
 ہر چیز بدلی ہوئی دیکھتا ہے۔ یہاں تو سماں ہی ترالا ہے، گھر والے
 کسی اور ہی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں، بیوی پر
 نظر پڑتی ہے تو ٹھٹک کر رہ جاتا ہے۔ اُس کا چھتری دار چہرہ فرطِ مسرت
 و کمال شادمانی سے کھلا ہوا ہے، باچھیں کھلی ہوئی ہیں، لبوں پر
 مسکراہٹ ہے، خوشی سے پھولی نہیں سماتی اور اُس کی پیشانی پر
 ایک نور ہے جو سورج کی طرح درخشندہ ہے۔ جب یا سر گھر میں
 آجاتا ہے تو اُس کی رفیقہٴ حیات بڑے جوش و سرگرمی سے اور
 بڑے تپاک سے اُس سے ملتی ہے۔ جب وہ قریب آجاتا ہے
 تو دھڑک کر اُس سے لپٹ جاتی ہے، اور نہایت مسرت انگیز لہجے

میں اُس سے کہتی ہے :-

سمیۃ: "یا سیر! مبارک ہو، خوش ہو جاؤ، آج عمار ہمارے پاس
دنیا اور آخرت کی بھلائی لے آیا ہے۔"

یا سیر:- (حیرت زدہ ہو کر) "آخرت... آخرت کیا... آخرت کیسی...
تم کیا کہہ رہی ہو...؟ میں تو زندگی سے تنگ آ گیا ہوں، راتوں
کو پریشان خواب دیکھتا ہوں اور دن میں لوگ تنگ کرتے
رہتے ہیں، نخر و مچروں کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں، عجب
کشمکش میں مبتلا ہوں۔"

عجب اک کشمکش میں تیرا بیمار محبت ہے

شفا کچھ اور کہتی ہے قضا کچھ اور کہتی ہے

عمار: (چپک کر) "ابا جان! خوش ہو جائیے، خدا آپ کو سلامت

رکھے، میں آپ کے لئے دنیا اور آخرت کی خوشیاں سمیٹ لایا ہوں

یا سیر:- "بتایگا بھی آخر تیرا کیا مطلب ہے، کیسی خوشیاں دنیا

تو بیچ رہی ہے کہ توبے دین ہو گیا، کم بخت تو نے ماں باپ کے

لئے کیا مصیبت کھڑی کر دی، یہ تو کیا کہہ رہا ہے، کیوں ہمیں

بیکالیف میں مبتلا کر رہا ہے۔"

عمار: (دہنس کر) نہیں نہیں ابا جان! بلکہ یوں فرمائیے کہ نعمتیں کہاں

سے سمیٹ لایا، میں تو آپ کے لئے دونوں جہانوں کی نعمتیں لیکر
 آیا ہوں، مانتا ہوں کہ کسی غنڈے نے آپ سے کہہ دیا ہوگا کہ
 مارے دین ہو گیا۔ لیکن درحقیقت میں نے اس سچے معبود
 کی غلامی پسند کی ہے جس نے یہ ساری کائنات بنائی، اور جس
 نے ہماری رہنمائی کے لئے محمد صلعم کو رسول بنا کر بھیجا، جو ہمیں
 سیدھی راہ دکھاتے ہیں، زندگی گزارنے کا صحیح صحیح طریقہ بتاتے
 ہیں، دینی بصیرت عطا فرماتے ہیں، اندھیروں سے اجالوں میں
 بحال کر لاتے ہیں، جہالت و نادانی کے ہولناک گڑبھوں سے نکال کر
 حکمت و دانائی اور علم و معرفت کی بلندیوں پر چڑھا کر لے جاتے ہیں
 ایمان والوں اور پارسائوں کو دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی رضامندی
 کی خوش خبری دیتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی اس کی رضامندی
 کی، جنت کی اور ثواب کی خوش خبری سناتے ہیں، اور جھٹلانے
 والوں اور نافرمانوں کو اس بات سے چوکتا کرتے ہیں کہ دنیا میں
 بھی ان پر خدا کی پھٹکار پڑتی ہے، اور مرنے کے بعد وہ ہمیشہ
 ہمیش کے لئے جہنمی ہو جاتے ہیں۔“

یا سرکان لگا کر یہ تمام باتیں سنتا ہے، گویا عمار کی یہ تمام
 باتیں یا سز کے کانوں سے گذر کر دل میں اتر رہی تھیں، اس کا

چہرہ رفتہ رفتہ سُرخ ہوتا جا رہا تھا، اور ایک بہار سی آتی جا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا چہرہ کندن کی طرح چمک اٹھتا۔ لیکن قوت رفتہ رفتہ زائل ہوتی جا رہی ہے۔ آخر کار بڑھال ہو گیا۔ یاسر گریبا ہی چاہتا ہے مگر جلدی سے سمیہ اور عمار دوڑ کر آتے ہیں اور اُسے بہارا دے کر بٹھا دیتے ہیں، اور کمال ہمدردی اور محبت سے اُس کی نگرانی کرنے لگتے ہیں۔ عمار سر دبلنے لگتے ہیں اور سمیہ چہرے سے پسینہ پونچھنے لگتی ہیں۔ پوڑھا یاسر خاموش اور بڑا بڑا ہوا ہے، لیکن کبھی کبھی اُس کی زبان سے بے ساختہ یہ کلمہ نکل جاتا ہے۔ "اچھا یہ ہے وہ بات اچھا یہ ہے وہ بات" عمار: (دھیمی آواز سے) "اباجان! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟" (یاسر جواب دینا چاہتا ہے، مگر حلق خشک ہو گیا ہے اور آواز گھٹ کر رہ گئی ہے)

یاسر: (آنکھوں میں آنسو لاکر بے شک یہی ہے وہ بات بیٹا تم نے مجھ سے ایک پرانی بات یاد دلادی، جب میں مکہ میں آیا تھا تو میری عمر بیس برس کی بھی نہ ہوگی۔ جب ہم نے آپس میں معاہدہ کیا تو ابو خدیفہ چاہتا تھا کہ ہم دیوتاؤں کے پاس جا کر اس معاہدہ کو بچتہ کر لیں، لیکن میں نے یہ بات نہ مانی۔ جب اس نے اس کی وجہ پوچھی تو میں نے

بتایا کہ اگر میں کسی کو اپنا معبود بتاتا تو سمندر کو بناتا، جو مجھے دہشت
 و ہیبت میں ڈال دیتا ہے، یا سورج کو بتاتا جو دنیا کو روشن
 رکھتا ہے، یا تاروں کو بتاتا جو رات کے وقت لوگوں کو راستہ
 بتاتے ہیں، لیکن میرے نزدیک ان میں سے کوئی بھی عبادت کے
 لائق نہیں، میرا دل کسی کی عبادت کو بھی قبول نہیں کرتا، نہ مجھے
 کبھی کسی سے ڈر یا کسی سے رغبت پیدا ہوئی۔ اب اللہ کے رسول
 نے بتایا کہ ان تمام چیزوں کا خالق اللہ ہے جو ان سب کا انتظام
 کرتا ہے تو یہی وہ بات ہے جو اب سے بہت دنوں پہلے ہی میرے
 دل میں کھٹک رہی تھی۔ یہ کہہ کر یا سر سر جھکا لیتا ہے اور کافی دیر
 تک سر جھکائے رکھتا ہے، جب سر اٹھاتا ہے تو آنکھوں سے حسب
 سابق آنسوؤں کی چھڑی لگی ہوئی ہے اور کہتا جا رہا ہے، "بلاشبہ
 یہی وہ بات ہے جس کی خاطر میں نے وطن چھوڑا، پردیس اختیار کیا،
 اپنے خاندان میں ایک رشتہ دار کی طرح رہنا گوارا نہیں کیا اور یہاں
 پردیس میں محرومیوں کا حلیف بن کر رہا، حالانکہ میں اپنے خاندان
 میں ہر دغیر تھا، میں نے اپنے بھائیوں کو بھی جو وطن جا رہے تھے
 چھوڑ دیا اور بطحار مکہ کی سکونت اختیار کر لی۔" اب یا سر سمیہ کے
 سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتا ہے اور کہتا ہے:

"سمیہ! مجھے تیری ہی محبت نے اس وقت کے انتظار کی دعوت دی ہے۔ یہ کہہ کر پھر سر جھکا لیتا ہے اور جب کافی دیر کے بعد سر اٹھاتا ہے تو گواہوں آنکھوں سے رک جاتے ہیں مگر ابھی ڈاڑھی میں موتیوں کی طرح آدینراں ہیں۔"

یاسر: (عمار سے) "اب کب اللہ کے رسول کے پاس چلو گے؟ ہم بھی تو ان سے حق والا کلمہ سن لیں۔"

عمار: "ابھی تشریف لے چلے۔"

اس دن کی شام کتنی ہولناک تھی، ابو جہل مخزومیوں کے آزاد اور غلام لوجوانوں کو لے کر یاسر کے گھر چڑھ آتا ہے، اور عمار یاسر اور سمیہ کو زنجیریں پہنا دیتا ہے، ان کے گھر میں آگ لگا دیتا ہے۔ جب لوگ ان بے گناہوں کو گھسیٹ کر ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کرنے کے لئے لے جانے لگے تو یاسر سمیہ سے کہتا ہے:

یاسر: "سمیہ، سمیہ! دیکھو میرے خواب کا آج پہلا دن ہے، اس خواب کی پہلی آگ ہم نے آنکھوں سے دیکھ لی۔"

عمار: "فکر نہ کیجئے، اس کے بعد جنت ہے جہاں نبی کے ماننے والوں کے لئے ہر طرح کا عیش و آرام ہے، اور سب سے بڑھ چڑھ کر حق تعالیٰ کے دیدار کی نعمت ہے۔"

اسلام کو مٹانے کی ناپاک کوشش

مت ستا ظالم کسی کو، مت کسی کی آہ لے
 دل کے دکھ جانے سے ناداں عرش بھی ہل جاتا ہے
 دوسرے روز جب سوج خوب چڑھ آتا ہے تو قریشی سرداروں
 کا مسجد میں ایک عام اجتماع ہوتا ہے۔ اس اجتماع میں نجاری
 باقیں یا کاروباری مشورے نہیں ہوتے، بلکہ اس تازہ فتنہ و فساد
 کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے جو ایک مخزومی سر بھرے نوجوان
 نے اس امن والے شہر میں برپا کر رکھا ہے، جہاں کے باشندوں
 کا یہ دستور ہی نہیں کہ بے گناہوں کے گھر جلائیں اور ناکردہ
 گناہگاروں کو قید و بند میں رکھیں۔ یہ وہ مقدس حرم مکہ ہے
 جہاں بے گناہ غورتوں اور مردوں کو طرح طرح کے غدا ب میں مبتلا
 کرنا انتہائی بُری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ولید بن مغیرہ: (ابو جہل سے) بیٹھے! کس قدر افسوس ناک بات ہے

تو نے اس پر امن حرم میں ایک ایسا طوفان برپا کر رکھا ہے جو
 قریشی روایتوں کے قطعی خلاف ہے، افسوس تو نے اس کے امن
 کو خاک میں ملا دیا، تو نے اس سلسلہ میں ہم سے مشورہ بھی نہیں کیا،
 اور نہ اپنی قوم کے بڑوں اور سمجھداروں کی رائے لی، تو نے من مانی
 کارروائی کی، جو جی میں آیا کیا۔ غرور و کبر نے تیری عقل برباد کر دی
 اور تو نے بے گناہوں پر مظالم ڈھانے شروع کر دیے۔ چند بیوقوف
 اور سرپھرے نوجوان تیرے ساتھ لگ گئے۔ دیوتاؤں کی قسم، مجھے
 اندیشہ ہے کہ میں تیری اس انسانیت سوز حرکت کا برا نتیجہ برآمد
 نہ ہو کیونکہ عرب کے دلوں میں خرم کی بڑی قدر و منزلت ہے، انھیں
 خوف و گھبراہٹ کے وقت یہاں امن میسر آتا ہے، بھوک کے
 وقت روٹی ملتی ہے، نازک وقتوں میں اور ناداری و افلاس
 کی حالت میں سب جگہ سے مایوس ہو کر عرب حرم ہی کا رخ کرتے
 ہیں، جہاں انھیں غربت و پریشانی کے چنگل سے نجات مل جاتی
 ہے۔ اور ہر طرح کا آرام، سکون، اطمینان قلب اور فراخی میسر
 آجاتی ہے۔ جب اس ہولناک حادثہ کی خبر دور دور تک عرب
 میں پھیلے گی اور وہ یہ سنیں گے کہ لوگ حرم محترم میں جا کر امن
 تلاش کیا کرتے تھے، اطمینان و فراخی ڈھونڈھا کرتے تھے اور

بیت اللہ کے سائے میں اطمینان کی سانس لیا کرتے تھے، مگر افسوس آج اس حرم میں بے گناہ مردوں اور عورتوں پر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں، آج کسی کو اس جگہ بھی امن و عافیت میسر نہیں۔ نہ وہاں سکون باقی رہا نہ اطمینان۔ لوگوں کے گھر جلائے جا رہے ہیں، انہیں گرفتار کیا جا رہا ہے اور طرح طرح کی سزائیں دی جا رہی ہیں۔ تو تو نے سوچا بھی لوگ کیا کہیں گے، جب اہل عرب سنیں گے کہ چند قریشی سرپھروں نے یہ اُدھم مچا رکھا ہے، جو کسی کی نہیں سنتے۔ اکابر اور لیڈروں سے رکے نہیں لیتے اور جو جی میں آتا ہے کرتے پھرتے ہیں۔ سر چڑھ کر کام کرتے ہیں نہ انہیں ہمسایوں کے حقوق کا لحاظ ہے اور نہ پناہ گزینوں اور حلیفوں کے معاہدہ کا پاس ہے۔ تو کتنی بدنامی ہوگی، میں محزومیوں سے کہتا ہوں کہ قیدیوں کو آزاد کر دیا جائے، اور تادان تجھ سے اور تیرے ساتھیوں سے دلوا یا جائے۔

یہ سن کر ابو جہل غصہ سے تمبٹا اٹھا، نتھنے پھول گئے، سانس زور زور سے چلنے لگا، آنکھوں سے چنگاریاں جھڑنے لگیں، اور

کہخت آواز میں بولا:

ابو جہل: افسوس اور صد افسوس، نیکی کا بدلہ برائی ہے۔ لات و

غزنی کی قسم، جب تک اس ہاتھ میں تلوار کا قبضہ ہے، کوئی مانی
 کا لال ان قیدیوں کو نہیں چھڑا سکتا، بے شک مجھے بھی معلوم ہے
 کہ میں نے قریشی دستور کے مطابق کام نہیں کیا ہے، لیکن چچا جان
 آپ کو محمدؐ کی بھی خبر ہے، مجھ سے پہلے محمدؐ نے شہر کے دستور کو
 بگاڑا ہے۔“

ولید:- (زری سے) ”بھتیجے! جھوٹ نہ بول، بتا محمدؐ نے کس کا گھر جلا
 کس پر مظالم ڈھائے اور کس کو قید کیا؟“
 ابو جہل:- ”بلکہ اس نے اس سے بھی زیادہ سنگین جرائم کا ارتکاب
 کیا، محمدؐ ہمارے غلاموں کو ہمارے خلاف سکھاتا پڑھاتا ہے، عوام
 کو ورغلاتا ہے، ہمارے دیوتاؤں سے انھیں بدظن کرتا ہے، اور
 اسی پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ ہماری دولت و ثروت کے پیچھے پڑا ہوا ہے
 لوگوں کے خیالات بگاڑتا ہے، ہمارے مراتب و مناصب کا انھیں
 لالچ دیتا ہے جو ہمیں ورثہ میں باپ دادا سے ملے ہیں، مگر ہٹنے کے
 بعد ہم نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اب ہم ان کی حفاظت
 و حمایت میں دن رات ایک کر دیں گے، اور انھیں کسی طرح
 ضائع نہ ہونے دیں گے، ہم ان کی حفاظت میں ایڑی چوٹی کا
 زور لگا دیں گے، ہر ممکن کوشش کریں گے اور اپنی تمام قوت اسی

پر صرف کہہ دیں گے۔ کیا آپ کو خبر نہیں محمدؐ کو مانتے والے کیسی
 کیسی باتیں بناتے ہیں۔ یہ زویل اور کینے یہ گمان کرنے لگے ہیں
 کہ ہم بھی حقوق انسانیت میں تمہارے برابر ہیں، جو جو ذمہ دار یا
 تم پر عائد ہوتی ہیں وہی ہم پر عائد ہوتی ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ
 اللہ کے نزدیک قدر و منزلت میں، غرت و عظمت میں اور احترام و
 اکرام میں ہم تم سے زیادہ ہیں، کیونکہ ہم خلوص سے اللہ کی عبادت
 کرتے ہیں اس پر ایمان لاتے ہیں اور اُس کے ساتھ عبادت میں
 کسی کو شریک نہیں کرتے۔ چچا جان! یہ تو تم نے خوب کہا، وہ تو
 بڑے ہوشیار، بیدار مغز اور سوچ سمجھ کر کام کرنے والے، اور ہم
 بے وقوف، سر بہرے، اور ناتجھی سے کام لینے والے ہیں۔ چچا جان!
 خبردار ہو جاؤ، اگر تم محمدؐ کو اور اُس کے ساتھیوں کو سرزمینِ حرم میں
 یہ گمراہ خیالات پھیلانے کی کھلم کھلا آزادی دیدو گے تو ایک دن
 وہ آجائے گا جب مکہ کے اونچے طبقے والے نیچے، اور نیچے طبقے والے
 اونچے ہو جائیں گے۔ اور تمہیں باپ دادا سے جو غرت، بزرگی، شرافت
 دولت مندی اور سرداری ملی ہے اُسے گنوا بیٹھو گے، اور اقتدار سے
 ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ اب بتاؤ کونسی بات بڑی ہے، آیا یہ بات بُری
 ہے کہ غرب میں یہ بات پھیل جائے کہ مکہ کے عقلا نادانوں کو

سیدھی راہ پر لانے کے لئے ڈانٹ ڈپٹ کر رہے ہیں اور انھیں مار مار کر سیدھا کر رہے ہیں، یا یہ بات کہ مکہ کے چند غلام سردار بن بیٹھے اور سردار غلام بن گئے۔ اور جن دیوتاؤں کی خاطر لوگ دور دراز سے سفر کی صعوبتیں اٹھا کر آتے تھے وہ محض مذاق و دل لگی کے لئے رہ گئے۔ دیوتاؤں کی قسم جب تک اس ہاتھ میں تلوار کا قبضہ ہے کوئی مائی کالال ان قیدیوں کے پاس آکر تو دیکھ اُمیہؓ، مرجبہ، صیدہ، مرجبہ، ابوا حکم زندہ رہو اور سلامت رہو، کل تم نے جو کچھ کیا واقعی ٹھیک کیا، اور اس وقت کیسی ہوشیاری سے منہ توڑ جواب دیا، خدا کی قسم! محمدؐ اور اس کے ساتھی اس قبیلے کے لئے بھلی گھونسہ ہیں، جب تک یہ کھٹکتا خار قبیلے کے پہلو سے نہ نکالا جائے گا فساد برپا رہیگا۔ زخم اسی وقت مندمل ہوتا ہے جب اندر سے فاسد مادہ نکال دیا جاتا ہے۔ اگر تمھارے چچا و کید کو بھی اپنے غلاموں اور حلیفوں سے وہی سابقہ پڑتا جو مجھے اپنے غلاموں اور حلیفوں سے پڑا ہے تو وہ کبھی تمھیں برا بھلا نہ کہتا، بلکہ تمھارا اور حوصلہ بڑھاتا اور تمھاری بڑائی کرتا۔ تم مخروم کے قیدیوں اور حلیفوں سے جو سلوک کل کر چکے ہو وہی سلوک میں نے بھی بنیائے جمع کے چند غلاموں اور حلیفوں سے آج کیا ہے۔ قریشو!

خدا کی قسم اب تمہاری خیر نہیں، یہ خواہ مخواہ کی لڑائی تمہارے سر
 تھوپ دی گئی ہے، جو گھروں کے بچوں بیچ چھٹری جا رہی ہے سب
 سے پہلے اس سے نمٹ لو۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارا مال و متاع
 اور ساز و سامان لوٹ لیا جائے، تمہارے حرم محترم کی حرمت بلیکٹ
 کر دی جائے، چند غنٹے تمہاری عورتوں، بیٹیوں اور بہنوں کو
 اٹھا کر لے جائیں، تمہارے دیوتاؤں کو برا بھلا کہا جائے، بلکہ انہیں
 توڑ پھوڑ دیا جائے۔ لوگ تمہارے شہر میں حج کرنے اور پناہ لینے
 سے روک دیے جائیں، لوگوں کی زبانوں پر تمہارے افسانے بجا
 اور قصہ گو تمہارے قصے بیان کیا کریں، تو محمد کو اور اس کے
 ساتھیوں کو آزاد چھوڑ دو اور انہیں من مانی کرنے دو، اور
 اگر تمہیں مال کی حفاظت منظور ہے، دیوتاؤں کا وقار قائم رکھنا
 ہے، اور حرم کے ادب و احترام کو برقرار رکھنا ہے تو غور و فکر سے
 کام لو، سوچ سمجھ کر قدم اٹھاؤ، کمریں کس لو، ہاتھوں کو مضبوط بناؤ،
 وقت کی نزاکت کا احساس کرو، سراپڑی کا زور لگا دو، اور ہر ممکن کوشش
 سے اس سر اٹھائے ہوئے فتنے کو دبا دو، اور ان چند نادالوں کو
 اُدھم نہ مچانے دو۔“

ابوسفیانؑ اُس مجھے بھی اندیشہ ہو گیا ہے کہ اگر آج میں تمہارا تہبارتی

مال لے کر شام یا مین چلا جاؤں، پھر ایک دو ماہ کے بعد آ کر مکہ کے
 خوش حال اور مال دار لوگوں کو دیکھوں تو انھیں ان کے گھروں
 اور جائداد سے محروم پاؤں۔ قریشیو! یہ بات خوب ذہن نشین کر لو کہ
 تجارت ایک بہترین پیشہ ہے اور اس میں بڑے بڑے فائدے ہیں،
 بشرطیکہ اس کا کوئی پشت پناہ ہو، ورنہ اس میں سرمایہ نقصان ہے،
 تم لوگ تجارت کی خاطر عرب کے بدوؤں کو کچھ دے دلا کر راضی رکھتے
 ہو، تاکہ تمہارا تجارتی قافلہ محفوظ رہ سکے۔ نادانو جب تم اپنے گھر
 میں رہ کر تجارت کو محفوظ نہ رکھ سکو گے تو باہر کی کیا خاک خیر خبر لو گے
 کان کھول کر سن لو جب تک تم مجھے یہ یقین نہ دلا دو گے کہ میرے بعد
 تم مکہ میں امن قائم رکھ سکو گے، میری ہر طرح مدد کرتے رہو گے،
 اور جب تک تمہاری طرف سے مجھے اس بات کا یقین نہ ہو جائیگا
 کہ جب مکہ لوٹ کر آؤں گا تو مکہ کے باشندوں کو اسی طرح امن و
 سلامتی سے پاؤں گا جس طرح انھیں چھوڑ کر گیا تھا، اُس وقت
 تک میں ایک جہہ بھر بھی مال لے کر نہ جاؤں گا۔ اگر تم اس بات
 کی ذمہ داری لیتے ہو کہ میں مکہ میں آ کر لکیوں کے نہ مال میں
 کمی پاؤں اور نہ جانوں میں، تو پھر میں تجارت کا غم کروں۔
 ولید! رہنس کہا افسوس! برد لو! میں نے اپنے بھتیجے کو برا بھلا

کیا کہا، تمہارے دلوں کا چور پکڑ لیا ہے۔ بھلے آدمیوں کیوں اس قدر سہمے ہوئے اور خوف زدہ ہو، نہ تمہاری زبان تمہارے قبضے میں رہی اور نہ تمہارے دل تمہارے بس میں رہے، ہر شخص اپنی اپنی بڑ ہانکے چلے جا رہا ہے، خوف و دہشت نے تمہیں آپلے سے باہر کر دیا ہے، چند آدمیوں کو ہتوا سمجھ بیٹھے ہو، یہ مسکینوں کی ایک چھوٹی سی جماعت ہے جس کا خوف تمہیں کھائے جا رہا ہے۔ اس حیرت جماعت کو عظیم نہ سمجھو، مجھے معلوم ہے یہ بے چارے تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ان کی باہمی گفتگو ہوتی رہتی ہے، نہ انہوں نے تمہارا خون کیا ہے اور نہ تمہارا مال لوٹا ہے۔“

ابوسفیان: ”آپ کا یہ مقصد ہے کہ ہم انہیں ڈھیل دیدیں، اور انہیں اپنی من مانی کرنے دیں۔“

ابو جہل: ”میں تو یہ غم کر چکا ہوں کہ آنے سے پہلے اس سیلاب کو روک دوں گا اور بڑھنے سے پہلے اس فتنے کو دبا دوں گا۔! ابوسفیان تم شوق سے تجارتی مال لے کر جہاں چاہو جاؤ میں ہر طرح کی ذمہ داری لیتا ہوں، مکینوں کی حفاظت کا بار میں نے اپنے کمزور کندھوں پر اٹھالیا ہے۔“

عتبہ: ”قریش کے جوانو! تم میں سے ہر شخص نے اپنی اپنی رائے

پیش کی اور وقت کے مناسب ہی رائے دی۔ ہوشیار ہو جاؤ، ہم یہ بات ہرگز برداشت نہیں کر سکتے کہ ہمارے عقلا، کو بے وقوف بنایا جائے اور ہمارے دیوتاؤں کی توہین کی جائے، یا ہمارا مال فتنہ و فساد کی بھینٹ چڑھ جائے۔ لیکن مناسب یہی بات ہے کہ ہمیں بجائے سختی اور تنگدلی کے نرمی اور بلند حوصلے سے کام لینا چاہیے۔ ہمیں اپنی قوم کے نادانوں اور احمقوں کو صبر، نرمی اور محبت سے سنبھالنا چاہیے البتہ حلیفوں اور غلاموں کو ڈنڈے سے سیدھا کیا جائے۔ اس پالیسی سے دو فائدے ہوں گے، ہمارے درمیان باہمی صلح بھی باقی رہے گی اور ان غلاموں اور حلیفوں کو دیکھ کر محمدؐ کے ساتھیوں کو عبرت و نصیحت بھی ہوگی، شاید ڈر کر محمدؐ کو چھوڑ دیں اور ہمارے ساتھ مل جائیں۔

ابو جہل: "میں نے بھی تو یہی کیا ہے، اس کے سوا اور کیا کیا ہے میں نے اپنے ضمیر کو کھیل کر ضبط سے کام لیا ہے۔ اگر میں اپنے دل کا کہنا مانتا تو لات و غزی کی قسم آرقم کی گردن ضرور اڑا دیتا، پھر کچھ ہی ہوا کرتا، اور اس کے گھر کو نذر آتش کر دیتا۔ شاید اس ترکیب سے میرے دل کی آگ بجھ جاتی۔ لیکن میں ہمیشہ مخزومیوں کے ساتھ صلح پسند رہا ہوں۔ اسی لئے تو میں نے ان حلیفوں اور غلاموں پر سخت

داروگیر کی ہے تاکہ قوم کے نادانوں کو عبرت ہو اور وہ ڈر کر ابائی دین میں لوٹ آئیں۔“

ولید: ”سہارا لے کر اٹھتا ہے اور تمسخرانہ انداز میں کہتا ہے:-
 بھتیجے! خدا کی قسم تو جو کچھ کہ رہا ہے انتہائی شرمناک ہے طاقتور اپنے برابر والوں سے طاقت آزمائی کرتا ہے، بے چارے حلیف، غلام اور گریے پڑے کمزور لوگوں کو ستا کر اپنی بزدلی اور حماقت کا ثبوت پیش کرنا ہے۔ لیکن ہزار افسوس جس کی بات ہی نہ مانی جائے اس کا مشورہ دینا نہ دینا برابر ہے۔“

اس کا ردوائی کے بعد یہ اجلاس ختم ہو جاتا ہے، قریشی اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں، صرف ابو جہل رہ جاتا ہے جو مخزومی لوجوالوں اور غلاموں کی ایک جماعت کے ساتھ ان بے گناہ قیدیوں کو ان کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں سے جن میں انہوں نے رات بسر کی ہے نکال رہا ہے اور ان پاکبازوں کو دھکے دے دے کر کہہ رہا ہے: ”کم بختو! تیز کیوں نہیں چلتے، کیا تمہارے پاؤں ٹوٹ گئے ہیں۔“ کون اس کم بخت سے پوچھے کہ اگر کوئی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے تو وہ کیسے تیز چل سکتا ہے۔ لیکن ابو جہل اور اس کے ساتھی ان بے کسوں کے جسموں میں برچھے چھو چھو کر، خنجر

مار مار کر انھیں ستارے ہیں، نیروں کی نوکوں سے ان کے جسم
 جگہ جگہ سے زخمی ہو جاتے ہیں، وہ اہو لہان ہو جاتے ہیں اور خون
 میں نہا جاتے ہیں، مگر ان اللہ کے بندوں کے عزم صمیم میں سر مو
 فرق نہیں آتا۔ ان کے زخمی جسموں پر کوڑے پڑ رہے ہیں، ٹنگے اور
 گھولنے پڑ رہے ہیں اور لاتوں سے تواضع کی جا رہی ہے۔ اور ان
 مظلوموں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جا رہے ہیں، کبھی کبھی
 عمار و یا سر کی ڈاڑھیاں پکڑ کر اور سمیہ کے سر کے بال پکڑ کر انہیں
 گھسیٹ بھی لیا جاتا ہے، اور زور سے تھپتھپ مار کر ہنس پڑتے
 ہیں، کم بخت شور مچاتے ہیں اور سیٹیاں بجاتے ہیں، جہاں جہاں
 سے گزرتے ہیں شور و غل سن کر لوگ اپنے اپنے گھروں سے
 نکل آتے ہیں۔ کھڑکیوں، برآمدوں، دروازوں اور چھتوں پر
 تماشے کے لئے ٹھٹ کے ٹھٹ جمع ہو جاتے ہیں۔ راہ گیر اور آس
 پاس والے یہ دردناک منظر دیکھ کر سہم جاتے ہیں۔ قیدیوں کے
 دل فریادی ہیں گو وہ اپنی زبانوں سے خاموش ہیں۔ انہوں نے
 ہتھیہ کر لیا ہے کہ وہ اب تک نہ کریں گے، اور نہ کسی طرح کی بے
 صبری اور بے قراری کا اظہار کریں گے۔ ظالموں کی رہنمائی میں مظلوموں
 کا یہ کاروان چلتا رہتا ہے۔ آخر ایک کھلے ریشیلے میدان میں

پہنچ جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر ابو جہل اور اُس کے ساتھی رُک جاتے ہیں۔ پھر ابو جہل آگے بڑھ کر یاسر کے پاس آتا ہے، ابو جہل: (تمسخرانہ انداز میں) "غدار! اب بھی تجھے ہوش آیا یا نہیں؟ معاہدے پر قائم رہنے کا اقرار کرتا ہے کہ نہیں۔ کل تک تو اقرار کرتا تھا، آج کیوں پھر گیا؟"

یاسر: "تو نے مظالم ڈھا کر ہم سے معاہدہ ٹوڑا دیا، اب اس کا بوجھ تجھ پر ہے ہم پر نہیں، ہم بڑی الذمہ ہیں۔"

ابو جہل: "اب ہمارے معاہدے سے تجھے کوئی تعلق نہیں رہانا!"
 یاسر: "ہاں ہاں ٹھیک اسی طرح جس طرح ہر قسم کے فتنہ و فساد اور ماتھے پر کلنگ کا ٹیکہ لگا دینے والی بُرائی سے مجھے کوئی تعلق نہیں رہا۔".....

ابو جہل بات بھی پوری نہیں کرنے دیتا کہ اس زور سے طمانچہ مارتا ہے کہ بکیں مظلوم کا چہرہ خونم خون ہو جاتا ہے۔ اُس کے ساتھی عمار اور سمیہ کو مار مار کر لہو لہان کر دیتے ہیں۔ پھر ابو جہل اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے کہ انھیں بھلستی ہوئی زمین پر ڈال دیا جائے چنانچہ بیچارے زمین پر ڈال دیئے جاتے ہیں، پھر ان کے سینے اور بیٹھیس گرم گرم لوہے سے داغی جاتی ہیں، پھر ان کی جھاتیوں پر

بھاری بھاری بھلستے ہوئے پتھر کھدے جاتے ہیں، پھر ان کے منہ پر پانی کی مشکوں کی مشکیں لٹھائی جاتی ہیں۔ ابو جہل کھڑا ہوا دل ہی دل میں کڑھ رہا ہے اور بے تاب ہے کہ کسی نہ کسی کی چیخنے کی آواز سُنے یا رونے دھونے کی آواز سُنے یا کراہنا سُنے یا کوئی رحم کی درخواست کرے، مگر نادان کو یہ معلوم نہ تھا کہ مسلمان جان دیدیتا ہے ان نہیں دیتا، یہاں تو یہ حال تھا
 زباں پر مہر خاموشی دلوں میں یاد کرتے ہیں

قیدی آپس میں دلوں ہی دلوں میں باتیں کر رہے ہیں، اور سچے بھی رہے ہیں۔ لیکن زباؤں پر مہر لگی ہوئی ہے، اور دل خدا کی یاد میں مصروف ہیں، ان مظلوموں نے اپنے جسموں کو ظالموں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا، وہ ان پر انسانیت سوز مظالم توڑ رہے تھے۔ جب ابو جہل اور اس کے ساتھی ان مظلوموں کے جسموں سے خوب کھیل چکے ہیں، اور ان کو ستا ستا کر خوب تماشا دیکھ چکے ہیں اور ان پر ظلم کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو انہیں اسی حال میں بھلستے ہوئے گرم گرم ریت پر پڑا چھوڑ دیتے ہیں، اور چند لوگوں کو ان کی نگرانی کے لئے مقرر کر کے چلے جاتے ہیں، تاکہ آرام کر لیں اور زوال کے بعد تازہ دم ہو کر پھر ان پر ظلم و ستم توڑیں۔

ایک اور غضب ہو گیا!

رفتہ رفتہ کھینچ رہا ہوں اُن کی منزل کے قریب
 رہ گیا ہے دیکھنا باقی بس اب قصر حبیب

حرب بن امیہ: (عبداللہ بن جعدان سے) ”میں تمہارے رومی غلام
 جیسی ہوشیاری اور سمجھ داری کسی میں نہیں دیکھتا، کاروبار میں
 تو یہ بڑا ماہر ہے۔“

عبداللہ: تمہاری اس بات پر کہتا ہوں کہ مجھے خبر نہیں، آیا
 جیسا کہ یہ کہتا ہے عربی ہے جس کو رومی بچپن میں پکڑ کر لے گئے
 تھے۔ جب انھوں نے فارس پر حملہ کیا تھا یا کہ رومی ہے، یا جیسا کہ
 کئی لوگ کہتے ہیں جن سے شام میں پہلے ہی سال یہ میرے لئے
 خرید لیا گیا تھا۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب عربوں نے اہل فارس
 کے ساتھ مل کر روم پر حملہ کیا تھا تو اُسے بھی روم سے پکڑ کر اپنے
 ساتھ لے گئے تھے۔“

اسکتے تھے۔ لیکن اس کی ہوشیاری ملاحظہ ہو۔ ریگ روال پر
 بننے والے ادنیٰوں کے بجائے کشتیوں میں مل لو کر سمندر کے
 آگے لڑتے ہو چکا دیا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ ایک اور
 برت انگیز اور تعجب خیز بات ہے، وہ یہ کہ اُس نے بوگوں کو
 نے ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا تاکہ وہ اپنی ضرورت کی چیزیں
 خرید کر انہیں کشتیوں میں لاد کر لے آئیں اور کشتیاں خالی
 واپس لوٹ کر نہ جائیں۔ ملاحظہ کیا آپ نے کیسا ہوشیار
 ہے، ایک وقت میں ہمیں نہ صرف دو سفروں سے بلکہ کئی
 سفروں سے بچا لیا۔“

عبداللہ میرے خیال میں صہیب بڑا ہوشیار، تجربہ کار، اور
 ذہین غلام ہے۔ شروع میں تو میں اُسے خریدنا بھی نہ چاہتا
 تھا، لیکن خریدنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ یہ مبارک ثابت
 ہوگا۔ چنانچہ اس سے ہر موقع پر فائدہ ہی فائدہ ہوا۔ اُس
 روز شام کے وقت عبداللہ نے اس رومی غلام کو جسے عربوں
 نے قید کر لیا تھا، یا اس عربی غلام کو جسے رومیوں نے قید کر لیا
 تھا خلوت میں بلایا اور کہنے لگا۔

عبداللہ صہیب! میں اور حبشہ والے سفر میں تو نے بڑی

ہوشیاری اور مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے، اگر حرب بھی تیری
تعریف نہ کرتا تو یہ بہت سا مال جسے لو لے کر آیا ہے، تیری
تعریف کے لئے کافی تھا۔ کیا تو نے اس سے پہلے بھی کاروبار
کیا ہے؟

صہیب: "نہیں، میرے لئے یہ پہلا کاروباری موقع ہے، اس سے
پہلے روزمرہ کی خرید و فروخت کے علاوہ جوہر شخص کیا ہی کرتا ہے
میں نے کوئی کاروبار نہیں کیا۔"
عبداللہ: "واہ واہ! پھر تو تیری گھٹی میں تجارت ہے، تجھ میں کار
کی فطری صلاحیت موجود ہے۔"

صہیب: شاید ایسا ہی ہو، عبداللہ بن جدعان تھوڑی دیر تک سر جو
بیٹھا اور صہیب جانے کا قصد کرنے لگا۔ لیکن عبداللہ نے اُسے
اشارے سے روک لیا، صہیب کچھ دیر تک اُس کے سر اٹھانے کا اور
حکم کا اتمظار کرتا ہے۔ لیکن اس کی خاموشی اتنا طول پکڑ جاتی ہے کہ صہیب
کھڑے کھڑے اکتا جاتا ہے۔ آخر خدا خدا کر کے عبداللہ اپنا سراٹھا
ہے اور صہیب سے بڑے سکون و اطمینان سے اپنے دل کی بات
چپاتے ہوئے کہتا ہے۔

عبداللہ: "صہیب! کیا تجھے غلامی پسند نہیں؟"

صہیب: بھلا کون ایسا شخص ہوگا جسے غلامی پسند آئے گی، اور غلامی سے نہ اکتائے گا۔

عبداللہ: میں تجھے آزاد کرنے کا اور خود مختار بنانے کا ہتھیہ کر چکا ہوں، لیکن اس سے پیشتر ایک اہم کام تیرے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔
صہیب: پھر تو اپنی آزادی اپنے ہی پاس رہنے دیجئے، مجھے ایسی آزادی نہیں چاہیے، آزادی کی خرید و فروخت نہیں ہوتی۔

عبداللہ: واہ! صہیب تو یہ کیا کہہ رہا ہے، میں نے تجھے کلبیوں سے خریدا تھا، اور کلبیوں نے نہ معلوم رومیوں سے خریدا یا عربوں سے! صہیب: نہیں نہیں! نہ آپ نے میرے دل سے مجھے خریدا اور نہ کلبیوں نے۔ مجھ پر ظالموں نے ظلم توڑا اور کلبیوں کو فروخت کر دیا، کلبیوں نے میری اجازت لئے بغیر آپ کو بیچ دیا۔ آپ لوگ مجھے ایک غلام سمجھ رہے ہیں، حالانکہ میں آزاد ہوں۔ آپ لوگ طاقت و اقتدار کے بل پر یا مال و دولت کی بدولت میرے جسم پر قابض ہو گئے لیکن میرا ضمیر اور میرا دل کسی کے بس کا نہیں ہے۔

عبداللہ: اگر بقرض حال مان لیا جائے کہ آزادی کی خرید و فروخت نہیں ہوتی تو پھر یہ کثرت سے لوٹھی غلام حصول آزادی کے لئے کیوں مکاتبت کا معاملہ کرتے ہیں، اور مال ادا کر کے کیوں آزاد

ہو جاتے ہیں۔ یہ مال کے بدلے آزادی نہیں تو اور کیا ہے۔“

صہیبؓ: ان کا فعل ان کے ساتھ ہے میں تو یہ معاملہ ہرگز نہ کروں گا کہ اپنی آزادی کو مال کے یا محنت کے بدلے خریدوں، میں تو اب بھی آزاد ہوں اور اپنے آپ کو آزاد ہی سمجھتا ہوں۔“

عبداللہؓ: حرب نے سچ کہا ہے کہ تو بڑا ہوشیار، ذہین اور بلند حوصلہ جوان ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں.....

صہیبؓ: یعنی آپ مجھ سے محنت لینا چاہتے ہیں، اور کسی کام کے خواہشمند ہیں۔ ٹھیک ہے۔ آپ کو مجھ پر جو اقتدار حاصل ہے وہ آپ کو کھلی آزادی دیتا ہے کہ مجھے آپ جس کام پر چاہیں لگا دیں۔ مجھ سے جو کام لینا چاہیں لے لیں، جو مرضی ہو حکم کریں فوراً بجالاؤں گا، لیکن مجھ سے کسی بات کا وعدہ نہ کیجئے، کیونکہ یہ چیز مجھے انتہائی ناپسند ہے۔ عبداللہؓ اس کی بات کا جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ صہیبؓ جلدی سے بول پڑتا ہے:

صہیبؓ: اگر اجازت ہو تو میں آپ کا بوجھ ہلکا کر دوں جس نے آپ کو جھکا رکھا ہے، اور وہ بات بتا دوں جسے آپ ظاہر کرنا نہیں چاہتے؟ عبداللہؓ: تو دونوں کی باتیں بھی جانتا ہے؟

صہیبؓ: چونکہ میں اپنے یمن والے اور حبش والے سفر میں کامیاب

رہا ہوں اور تمہارے پاس بہت کچھ مال لے کر آیا ہوں اس لئے اب تمہاری یہ آرزو ہے کہ اگر مجھے شام یا کسی دیگر ملک میں تجارت کے لئے بھیجا جائے تو تمہارے گمان میں جاؤںے والے سفر سے زیادہ اس سفر میں مال و دولت لاؤں گا تم اپنا مال اور کاروبار تو میرے حوالے کر کے میری طرف سے مطمئن ہو کہ میں اس میں نقصان نہ ہونے دوں گا اور تمہارا اصلی سرمایہ مع منافع کے تمہیں واپس لوٹا دوں گا، لیکن افسوس تم میری جان مجھے حوالہ کرنے کے لئے تیار نہیں۔ تمہارا خیال ہے کہ اگر میں روم پہنچ جاؤں گا تو چونکہ میں وہاں ایک آزاد انسان کی طرح پایا بڑھا ہوں، ممکن ہے وہیں رہ پڑوں، واپس نہ آؤں اور تمہاری امانت ہٹ کر جاؤں۔“

عبداللہ: ”نہیں نہیں، ایسی بات نہیں ہے، میری نگاہ میں تو امانت ہے، مجھے امانت میں خیانت کا بالکل اندیشہ نہیں۔“

صہیب: ”کیا میں تمہارا مال نہیں ہوں، اگر دوسرے مال کی طرح مجھے میری جان بھی حوالے کر دی جائے تو تمہیں ایک بوجھ سے بھی راحت مل جائے گی، پھر روم کے تجارتی سفر کا انتظام کر لینا، میں بہت جلد ہی تمہارے پاس اتنا کثیر مال لیکر آؤں گا کہ اب سے پہلے کسی نے کسی کو اتنا مال لاکر نہ دیا ہوگا، مجھے رومیوں کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ چیزیں خوب معلوم ہیں۔“

یقین مانو مجھے روم میں رہنے کی خواہش نہیں، میں نے آغاز جوانی میں
 تہیہ کر لیا تھا کہ میں تمہارے ہی شہر میں اقامت اختیار کروں گا کیونکہ
 اس شہر میں مجھ سے کوئی کام جسے میں نہیں جانتا وابستہ ہے۔ اگر یہ
 بات نہ ہوتی تو تمہارے شہر میں کبھی نہ نکلتا اور تمہاری غلامی کبھی قبول نہ کرتا
 مجھ جیسے انسان کے لئے بھاگنا بہت آسان ہے خصوصاً اس صورت
 میں کہ تمہارے پاس نہ کوئی پولیس ہے نہ فوج ہے اور نہ کو تو والی ہے اگر
 میں چاہتا تو تمہیں دھوکہ دے کر جاسکتا تھا اور تمہارے حرم کو چھوڑ سکتا
 تھا۔ تم مجھے عمر بھر ڈھونڈتے ہی رہتے اور میرا کھوج نہیں لگا سکتے۔ اگر
 بفرض مجال مجھے یا بھی لیتے تو مجھ پر قابو نہیں پاسکتے۔“
 عبداللہؓ: ہمارے شہر میں تیرا کوئی کام وابستہ ہے؟ آخر بتا تو سہی کیا
 کام ہے؟

صہیبؓ: افسوس اگر مجھے معلوم ہوتا تو بتا دیتا، مجھے آغاز جوانی میں
 صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ میری زندگی اور موت اسی سرزمین حجاز میں
 ہے میں اپنی عمر کا ایک حصہ تمہارے حرم میں گزاروں گا اور باقی حصہ
 ایک دوسرے حرم میں گزاروں گا۔ لیکن میرا انتقال سرزمین حجاز ہی میں
 ہوگا اور یہیں مدفون ہوں گا۔“

عبداللہؓ: صہیب! آج تو کیا کہہ رہا ہے، تو نے تو مجھے پہیلیاں سنانی

دع کر دیں۔ میرے علم میں ملک عرب میں صرف یہی ایک حرم ہے، دوسرا
کوئی حرم ہے نہیں!

پہلیب: مجھے بھی معلوم ہے، لیکن مجھے دوسرے حرم کی خبر دی گئی ہے
بے ایک رومی کاہن نے یہ بات بتائی تھی جسے میں اب تک سمجھ نہ سکا اور
میں نے اس بارے میں کچھ زیادہ غور و غوض ہی کیا۔ آخر کار مجھے لوگوں
نے کلبیوں کے ہاتھ بیچ دیا، پھر میں نے اپنے مالکوں کی آپس کی
تنگو میں سنا کہ وہ مجھے بڑے فائدے سے قریشیوں کے ہاتھ بیچ
دیں گے۔ تب میرا ادھر دھیان گیا۔ اگر میں کلبیوں سے جان چھڑانا چاہتا
تو بڑی آسانی سے چھڑا سکتا تھا۔ مگر میرے دل میں کاہن کی پیشین گوئی
کھٹک رہی تھی، جو اب تک صحیح اور ٹھیک ہی معلوم ہو رہی تھی۔ میرا خیال
ہے کہ آئندہ بھی یہ سچی ہی ثابت ہوگی، لہذا مجھے کاروباری سلسلے میں
جہاں جا بوجھو۔ بہر حال میں تمہارا ہی خواہ رہوں گا اور گھوم پھر کر آخر
تمہارے ہی پاس آؤں گا، اگر چاہو تو مجھے آزاد کر دو، کیونکہ میں
تمہارے شہر سے جانے والا تو ہوں نہیں، رہوں گا یہیں، یہاں سے
ہٹ نہیں سکتا۔ جب تک اس پیشین گوئی کا ٹھوس نہ ہو۔ اگر تمہارا
جی چاہے کل صبح مجھے یہاں سے نکال کر آڑ مالو، شام تک یہیں واپس
آ جاؤں گا۔

عبداللہؑ میں نے ایسا سرفروش نڈر بہادر کبھی نہیں دیکھا۔
صہیب: "تو پھر میرا مشورہ ٹھیک ہے نا؟"

عبداللہؑ: "اچھا آؤ، ذرا میرے ساتھ مسجد تک چلو، میں قریشیوں کو
گواہ بنا کر تمہیں آزاد کر دوں گا۔"

صہیب: "مجھے اپنی آزادی پر دوسروں کو گواہ بنانے کی چنداں
ضرورت نہیں۔" دوسرے دن صبح صبح عبداللہؑ قریشیوں کی بیٹھکان
میں جا رہے اور ان سے کہتا ہے کہ میں نے اپنے رومی غلام صہیب کو
آزاد کر کے اپنا حلیف بنا لیا ہے اور اپنا تمام کاروبار اس کے سپرد کر دیا
ہے، اب وہ سیاہ و سفید کا مالک ہے۔ قریشی عبداللہؑ کی یہ بات
سن کر اچنبھا نہیں کرتے، کیونکہ انہیں حرب کی زبانی صہیب کے
کاروباری لیاقت خوب معلوم ہو چکی تھی۔ صہیب اپنی شگفتہ جوانی
کے ایام عبداللہؑ کی تجارت میں گزار دیتا ہے۔ عبداللہؑ کے مال کو
بڑھاتا رہتا ہے، اس کی تجارت کو فروغ دیتا رہتا ہے، کبھی تجارتی
مال لے کر حبش جاتا ہے اور کبھی روم و عراق کا سفر کرتا ہے۔
صہیب ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ عبداللہؑ قریشیوں میں بڑا
دولت مند ملک التجار سمجھا جانے لگا۔ اس کی ثروت وسیع سے
وسیع تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ پھر جو دو کرم میں بھی سب سے آگے

آگے سے۔ شعراء اس کی مدح میں قصائد لاتے ہیں اور سونے چاندی کے ڈھیر اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ جب عبد اللہ یہ قصائد سنتا ہے تو انہیں پسند کرتا ہے تو صہیب سے صاف صاف کہہ دیتا ہے۔
 عبد اللہ: "ان قصائد میں آدھی تعریف تمہاری ہے، کیونکہ تمہیں نے تو میرے لئے اس سعادت کے اسباب مہیا کئے اور اس کے ذرائع آسان بنائے۔"

کبھی کبھی عبد اللہ صہیب سے پوچھ بھی لیتا ہے :-
 عبد اللہ: "صہیب! تمہارا وہ کام کیا اب بھی ہمارے ملک میں باقی ہے؟
 صہیب: "ہاں، کوئی نہ کوئی کام تو ضرور ہو گا ہی!"
 عبد اللہ: "آخر بتاؤ تو یہی وہ کون سا کام ہے؟"
 صہیب: "اگر مجھے بتانا ہی ہوتا تو تم سے ہرگز نہ چھپاتا۔"
 یوں ہی زمانہ گزرتا گیا، دنوں کے بعد ہفتے، ہفتوں کے بعد مہینے اور مہینوں کے بعد سال آتے جاتے رہے۔ آخر ایک دن عبد اللہ بھی موت کے آغوش میں جا سوتا ہے اور صہیب ہر طرح آزاد ہو جاتا ہے صہیب کے مال و دولت میں خوب برکت ہوتی رہتی ہے اور دن رات بڑھتا رہتا ہے۔ آخر کار ایک دن صہیب بھی بڑا تاجر اور بڑا مالدار سمجھا جاتا ہے۔ اب اگر صہیب چاہتا تو سرزمین شام کو واپس جاسکتا تھا

جہاں پلا بڑھا تھا یا سرزمین عراق کا رخ کر سکتا تھا جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔
 لیکن صہیب کی حاجت تو مکہ معظمہ سے انکی ہوئی تھی، بھلا اسے کیسے
 چھوڑتا۔ اب صہیب کے کاروبار میں کافی ترقی ہو گئی اور کافی پھیل گیا،
 اس نے باہر کا آنا جانا بند کر دیا، اور عبداللہ بن جعدان کی روایت کو
 تازہ رکھنے کی کوشش میں مصروف رہنے لگا۔ بھوکوں کا پیٹ بھرتا،
 غریبوں کی خبر گیری کرتا اور محتاجوں کی مدد کرتا۔ اس کی جو دو سجانے ملک
 میں اس کا بڑا نام پیدا کر دیا۔ قریشیوں کو اس پر کافی اعتماد ہو گیا،
 اور وہ اس کی باتوں میں کافی دلچسپی لینے لگے، حالانکہ اس کی عربی
 ٹوٹی پھوٹی تھی اور لہجہ بھی عجیب تھا۔ آخر کار رفتہ رفتہ وہ دن بھی آ
 پہنچا، جب انقلاب کی چنگاریوں سے قریشی بیٹھکین پریشان تھیں
 ایک روز صبح صبح یہ بھی ان بیٹھکوں میں پہنچ جاتا ہے اور قریشیوں
 کی باتیں خوب غور سے سنتا ہے۔ آرم کے گھر کا، محمد بن عبداللہ کے
 پاس لوگوں کے اجتماع کا، قرآن پاک کی تلاوت کا، اور نبی
 تحریک کے مرکزی دفتر کا ذکر چھڑا ہوا ہے۔ صہیب جو کتا ہوتا ہے
 اور ایسا محسوس کرتا ہے کہ شاید اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کا
 اب وقت آیا ہے۔

جب اس کے لڑکپن اور جوانی کا سنگم تھا تو کاہن نے اس سے

تھا کہ تیری زندگی اور موت ارضِ حجاز میں ہے، کاہن کی پیشین گوئی
 نہ رفتہ نزدیک آتی جا رہی ہے۔ جب وہ جوانی کی سرحد پار کر کے
 ہالے میں قدم رکھتا ہے تو منزل سامنے دیکھتا ہے، صہیب کا دل
 تاتا ہے، چل آرم کے گھر چل کر تو بھی نبیؐ کا دیدار کر کے اپنی برسوں
 کی بیاس بھجالے۔ مگر جسم کہتا ہے نہیں نہیں، بڑا خطرناک اقدام ہے
 ان میں تارے نظر آجائیں گے، لوہے کے حے چبانے
 جائیں گے، دل چاہتا ہے اڑ کر اللہ کے رسولؐ کو جا کر سلام
 دے، لیکن جسم اُسے ڈانٹ دیتا ہے کہ خبردار اس پیر خاروادی
 میں قدم نہ رکھنا، یہاں آکر بڑے بڑوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں
 سخت اگر تو نے یہ خطرناک اقدام کیا تو قریشیوں سے دوستانہ تعلقات
 ختم ہو جائیں گے، بلکہ وہ اور اُلٹے دشمن ہو جائیں گے۔ لیکن دل کے
 شوق نے دن کی راحت اور رات کی نیند اڑا دی۔

آخر ان کے جسم پر دل فتح پالیتا ہے، گھبرا کر گھر سے نکل کھڑے
 ہوتے ہیں، بیت اللہ کا غم کر کے چلتے ہیں، لیکن بے خبر اقطاں
 و خیراں کسی گہرے خیال میں غرق چلے جا رہے ہیں۔ ایک جگہ
 پہنچ کر ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں۔ بیت اللہ تو نہیں مگر کاشانہ محبوب
 آنکھوں کے سامنے ہے، خوش قسمتی سے دار آرم کے پاس ہی

کھڑے ہیں، اور اپنے قریب ہی عمار کو دیکھ رہے ہیں، پھر وہ
 میں بات چیت ہوتی ہے جس کا بیان اوپر ہو چکا۔ آخر دو نول
 مشتاقانِ جمالِ رسولؐ اندر جا کر اللہ کے رسولؐ (صلی اللہ علیہ وسلم)
 کا مبارک اور رُش بھرا کلام سنتے ہیں اور مسلمان ہو جاتے ہیں۔
 پھر اپنی جماعت میں رہ کر مسئلے مسائل سیکھتے ہیں اور شام کو چھپ
 چھپا کر اپنے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ قریشیوں نے اس دن صہیبؓ
 کو ہر خرید ڈھونڈھا، مگر صہیب اب کہاں، وہ تو ان ناپاکوں سے
 بہت دور ہٹ گئے، دوسرے دن پھر تلاش کئے گئے۔ مگر صہیب
 نہ ملنے تھے نہ ملے۔ ابو جہل نے انھیں ڈھونڈھنے میں سر توڑ کوشش
 کی اور دن رات ایک کر دیا مگر صہیب کی ہوا بھی نہ ملی۔ آخر کرب تک
 ایک دن ابو جہل کو خبر مل ہی گئی اور ان کے مسلمان ہونے کا حال
 معلوم ہو ہی گیا۔ ابو جہل طیش کھاتا ہوا اور لال پیلا ہوتا ہوا قریشیوں
 کی بیٹھک میں آتا ہے۔ قریشی جب اُسے آتا دیکھتے ہیں تو ایک کہتا
 ہے آج ابوالحکم کے تیور بدلے ہوئے ہیں اور پارہ چڑھا ہوا ہے۔
 زباں پر گالیاں، ہاتھوں میں خیر، تن کے بیٹھے ہیں
 کسی سے آج بگڑی ہے، جو یوں بن ٹھن کے بیٹھے ہیں
 ابو جہل آتا ہے، اور اپنی کمان سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوتا ہے اور اہتا

بناک اور بھرائی ہوئی آواز میں کہتا ہے :-
 "جہل :- قریشیو! افسوس..... صہیب بھی بے دین ہو گیا!
 ... آج سے وہ بھی آل یاسر کے ساتھ منرا میں شریک رہے گا۔"

ابرہہ کی تباہی

مقدر نے لیے کیا کیا نہ اے جانِ جہاں بدلے
 زمیں بدلے، زماں بدلے، ملکیں بدلے مکاں بدلے
 اہل خشم نے بھلا کہاں ایسے مبارک دن دیکھے تھے، کہ
 دشمن بغیر لڑے بھڑے تباہ ہو جائے اور وہ فتح و ظفر کے شادیاں
 بجائے لگیں۔ یہ اُن کی خوش قسمتی ہے کہ ربِ کعبہ نے اُن کی
 طرف سے مدافعت کی اور دشمن کو مار بھگا یا۔ دشمن کا بے شمار
 مال اُنہوں نے لوٹا، جس کی خاطر اُن کے پاؤں میں کانٹا بھی
 نہ چبھا۔ کیسی لڑائی اور کیسی دشمن کی مدافعت گھروالے نے خود
 اپنے گھر کا انتظام کر لیا۔ دشمن ایسا سٹ پٹا کر بھاگا کہ قیمتی
 سے قیمتی مال بھی چھوڑ گیا۔ آج ہر خشمی کے سامنے مال پڑا
 ہوا ہے، جتنا جی میں آئے لے لے۔ بلکہ جتنا اٹھایا جا سکے
 اٹھالے۔ نجاشی کا مال خوب لوٹا جا رہا ہے، ہر شخص اپنی مرضی کے

مطابق لے کر چلتا نظر آ رہا ہے، تھوڑے مال سے تو کسی کا دل
بھرتا ہی نہیں، نہ کوئی معمولی مال پر قناعت کرتا ہے۔ اگر ان کے
بس میں ہوتا تو آج وہ نجاشی کا سارا مال سمیٹ لیتے، اور اپنی
تجوریاں بھر لیتے۔ کیونکہ آج امیرہہ کا لشکر بڑی طرح پسپا ہو کر
نہایت ہی کس میرسی کی حالت میں بھاگ رہا ہے۔ اس کی شان
و شوکت، عظمت و ہیبت طاقت و قوت اور لاؤ لشکر کا برا
انجام ہوا ہے۔ اس کا کرو فراس کا رعب و داب اور اس کی
آن و بان ذرا سی دیر میں مٹی میں مل گئی۔ گھر والے نے
تنکے کی طرح اس کے سارے کس بل نکال دیئے اور تماشا یہ
کہ جنگ بھی تو نہ لڑی گئی۔ لشکر کا امیر اور اس کا سپہ سالار بیمار و
لاغری میں مبتلا ہے، اس کی آنکھوں کے سامنے موت کا بھیانک
منظر پھر رہا ہے، قضا اپنے خونی نیچے اور خونناک دانت دکھا
دکھا کر غریب کو ادھ مٹا کئے دے رہی ہے۔ مگر زندگی کی کرن
چمکتے ہی جان میں جان آجاتی ہے، کچھ سکون ہو جاتا ہے،
کچھ امید بندھ جاتی ہے اور کچھ تسکین ہو جاتی ہے۔ مگر دل میں
بے چینیوں، بے قراریوں، پریشانیوں، الجھنوں اور حیرانیوں کے
پھر بھی جھگٹے ہیں۔ صبح کو زندگی کی امید بندھ جاتی ہے اور شام

کو یہ اُمید بھی ختم ہو جاتی ہے۔

شکل اُمید تو کب ہم کو نظر آتی ہے

صورتِ یاس بھی بن بن کے بگڑ جاتی ہے

وہ بچا کھچا لشکر جس سے پرندوں کے غولوں نے درگزر کر دی

ہے جن پر چھوٹے چھوٹے پرندوں کو ترس آ گیا ہے اور جنہیں موت

نے اپنے آہنی پنجوں میں نہیں جکڑا ہے، ایک بے سری فوج کی

طرح تتر بتر ہو کر انتہائی بے بسی اور بے کسی کی حالت میں بُری طرح

بھاگ رہے ہیں۔ ٹانگوں نے چلنے سے جواب دیدیا ہے، مگر پھر

بھی گھسٹ رہی ہیں، بدن تھک کر چور ہو گئے ہیں اور چہروں پر

نا اُمیدی چھا رہی ہے۔ بیچارے شکستہ دل اور ٹڈھال ہو کر

سہمے ہوئے دوڑ رہے ہیں، جیسے چند سائے ساز و سامان کو

گھسیٹتے پھر رہے ہوں، جو خوف زدہ ہوں، خود خوفناک نہ ہوں

ابھی کچھ دن پیشتر قبیلہ خشم نے ابرہہ کے لشکر جرار کو پورے

ساز و سامان اور بڑی شان و شوکت سے مکہ کی طرف بڑھتا ہوا

دیکھا تھا، جس کے ساتھ سامانِ حرب کے علاوہ سامانِ تفریح و

نشاط بھی تھا۔ اس قبیلے کے اکابر اور عقلا نے اس کی قطعی

مزاحمت نہیں کی اور اسے بلا مزاحمت مکہ کی طرف بڑھنے دیا،

کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ ابرہہ کا غم نہایت ناپاک ہے، وہ ایک بڑے گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے، چنانچہ اس کی راہ سے ہٹ گئے اور اس کے ساتھ کسی معاملہ یا مفاہمت سے بھی کتراتے رہے۔ ان لوگوں نے اس سے تعاون یا شرکت کو بھی گوارا نہ کیا البتہ ان کے نادان، نا تجربہ کار اور جوانی کے جوش میں گمراہے ہوئے لوگ کئی حصوں میں بٹ گئے۔ بعض تو اس کی راہ میں حائل ہوئے لیکن مقابلہ کی تاب نہ لا کر ذلیل ہو کر رہ گئے۔ بعض نے نتائج سے بے خبر ہو کر چند پیسوں میں ابرہہ سے معاملہ کر لیا، اور گناہ کو ہلکا سمجھ کر چند ٹکوں کے لالچ میں آکر حرم کی توہین کی۔ اور بعض ابرہہ کی راہ میں حائل تو نہیں ہوئے لیکن الگ ہٹ کر اس کی گھات میں بیٹھ گئے کہ جب لشکر ادھر سے گزرے تو اس کی غفلتوں سے فائدہ اٹھا کر لوٹ مار کریں اور پھر اپنی اپنی گھائیوں میں جا چھپیں۔ چنانچہ وہ اسی طرح لشکر کو تنگ کرتے رہے۔ ابرہہ دل ہی دل میں مسکلتا رہا۔ ان کے ناپاک خیالات اس نے بھانپ لئے، اور جیل بھن کر اس نے قسم کھالی کہ مکہ سے واپسی کے وقت ضرور ان کی گوشمالی کی جائے گی، اور ایسی عبرتناک سزا دی جائے گی جسے وہ عمر بھر یاد رکھیں گے۔ اور عرب ان کے افسانے بیان

کریں گے۔ اُس وقت نجاشی کے رعب و داب اور اُس کے جاہ و جلال کا اُنھیں اندازہ ہو گا۔۔۔۔۔ لیکن ابرہہ نہ مکہ ہی میں داخل ہو سکا اور نہ بیت اللہ کو ذرہ برابر نقصان پہونچا سکا۔ پھر نہ تو فاتحانہ شان سے مکہ سے واپس ہوا نہ اپنے ناپاک ارادے میں کامیاب ہو کر لوٹا، بلکہ ایک ایسے شکست یافتہ لشکر کی طرح اُلٹے پاؤں بھاگا۔ جس کو حوادثِ زمانہ نے پائمال کر دیا ہو۔ گو اُس نے اپنے مقابلہ پر کسی کو مزاحمت کرنے والا نہ پایا نہ اُس کا کسی لشکر نے مقابلہ کیا۔ وہ تو دشمن کو دیکھ بھی نہ سکا۔ چند چھوٹے چھوٹے پرندوں نے اُس کے لشکر کے ہوش اڑائے اور اپنے کنکروں سے چبائے ہوئے بھوسے کی طرح بنا دیا اُس نے سمندر کی جانب سے پرندوں کے جھلرے کے جھلرے آتے دیکھے جو چھوٹے چھوٹے کنکروں کی اس کے لشکر پر بارش کر رہے ہیں، اور لشکر میں بُری طرح بگاڑ مچا ہوئی ہے۔ ہاتھی الگ جنگھاڑ رہے ہیں۔ انعاموں کی خوفناک چیخوں سے الگ میدانِ جنگ گونجا ہوا ہے۔ ابرہہ کے خاص خاص آدمی اُسے یمن کی طرف لے کر دوڑے۔ اس ناگہانی آفت اور آسمانی بلانے اُسے بالکل لاغر و نحیف اور مُردہ بنا دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ صبح و شام

میں چل بسے گا۔ یہ پرندوں کا پاپا کیا ہوا لشکر خشمیوں کے پاس سے بھی گذرا۔ لیکن اب ان میں دم خم کہاں باقی تھا جو اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہناتے چپ چاپ نکلے چلے گئے، نہ ان پر حملہ کیا نہ ان کی گوشمالی کی نہ انہیں ادب سکھایا اور نہ ان پر اپنا غصہ اتارا، بلکہ انہیں پر خشمیوں نے اپنا حملہ کر دیا، ان کی خوب گوشمالی کی، خوب دل کی بھڑاس نکالی، خوب ان پر بھڑکے اور انہیں جھٹی کا دودھ یاد دلایا یہ خدا کے غضب میں گھرا ہوا بقیہ لشکر بڑی مشکل سے قبیلہ خشم سے اپنا پیچھا چھڑا سکا، اور بڑی تکالیف سے اسے دو چار ہونا پڑا یہ لوگ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا اپنے سردار کو اٹھائے ہوئے اُلٹے سیدھے بھاگے چلے جا رہے تھے۔ آخر بمشکل تمام اسے اس کے پایہ تحت صنعار تک لے کر پہنچ ہی گئے۔ اس صدمے کی تاب نہ لاکر صنعار میں ابرہہ نے ایک عرصہ دراز کے بعد بیماری کی وجہ سے دم توڑ دیا۔ چلے تھے کعبہ کو ڈھالے خود ہی ڈھیر ہو گئے۔ یہ دن خشم کے لئے بڑا مبارک دن تھا۔ نجاشی کا مال جگہ جگہ بکھرا پڑا تھا جس میں سامان حرب، اڈنٹ، گھوڑے اور حسین و جمیل خوبصورت عورتیں بھی تھیں۔ قبیلہ خشم نے اس نعمت غیر مترقبہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیا، ہر طرح کا مال لوٹا، ہر قسم کا سامان لپا، سونا، چاندی،

خنجر، تلوار، اونٹ، گھوڑا، عورت جو بھی ہاتھ لگالے گیا۔ ایک طرف
تو سونے چاندی اور روپے پیسے سے دامن بھرے، دوسری طرف
اونٹ گھوڑے پکڑے جنہیں بیچ کر اپنی اپنی تجوریوں بھر لیں۔ اس
قیمت کے مال میں انہیں حبشہ کی دو شیرائیں بھی ہاتھ آئیں۔
شریف امراء کی بہت سی ہوشیار لڑکیاں اور عورتیں بھی ملیں، جو
سیر و تفریح کی غرض سے ابراہم کے لشکر کے ساتھ ہو گئی تھیں،
جنہیں اس لشکر کی مصاحبت میں بڑا لطف و سرور اور انتہائی
مزا آ رہا تھا۔ ان عورتوں کے باپ بھائی اور شوہر بھی اسی بات
میں ان کی دلجوئی سمجھتے تھے کہ یہ ان کے ساتھ ساتھ رہیں تاکہ
ان کے دل میں میل نہ آنے پائے؛ ان کا غم غلط ہوتا رہے، اور
ساتھ رکھنے میں خود ان کا بھی فائدہ تھا۔ انہیں بھی تو ان سے
کیف و سرور حاصل ہوتا تھا، اور تفریح طبع کا سامان فراہم ہو رہا
تھا۔ اس سفر سے محض یہ مقصد تھا کہ بیت اللہ کو منہدم کر کے ان
اچڑ جنگلیوں کو ادب سکھایا جائے جن کا یہ عقیدہ ہے کہ محض
بیت اللہ ہی قابل احترام و اکرام ہے اور ہر قسم کی تقدیس ہی
کے لائق ہے۔ صرف اسی کی عزت کرنی اور اسی کا طواف کرنا
انسان کا فرض ہے۔ ایک بہترین اور درمیانی سفر میں جب تک

عیش و طرب کا سامان موجود نہ ہو اور ہر طرح کی آسائش و راحت
میسر نہ آئے تو وہ پھیکا پھیکا اور بے کیف سا رہتا ہے۔ اس قسم کے
سفر میں جسمانی لذتیں، تسکین کے سامان، روحانی مسرتیں، اور
آنکھوں کی ٹھنڈک کے سر و سامان ضرور موجود رہنے چاہئیں۔

اسی وجہ سے سرداروں اور امیروں نے اپنی اپنی بیویوں، بہنوں
اور بیٹیوں کو ساتھ لے لیا تھا۔ جو اپنی محبت و دل سوزی سے ان
کے دل گرا بیٹیں، اپنی اداؤں سے انھیں رجھائیں، اور اپنے
حُسن و جمال سے ان کے دل لُبھائیں۔ علاوہ ازیں رقاصائیں،
موسیقاریں، طبلچی اور گانے والی لونڈیاں بھی ساتھ ساتھ تھیں۔
جو سفر کی رونق کو دوبالا کر رہی تھیں، اور کیف و سرور میں اضافہ
کر رہی تھیں۔ انھیں یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ہماری بیویاں اور
ہماری مائیں بہنیں ان سنگدل بے رحم گنواروں کے ہتھے چڑھ
جائیں گی جو راستے میں پڑتے ہیں اور جنگلی اُجڑ شہریوں کی لونڈیاں
بن جائیں گی۔

مالِ غنیمت لوٹنے کے لئے دیگر لوگوں کی طرح سحیم بھی نکلتا ہے۔

چونکہ سعیم نے بھی اپنے قبیلہ والوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا تھا اس
 ال غنیمت کا وہ بھی حقدار بن گیا تھا لہذا وہ بھی ہر طرح کا مال لوٹتا
 ہے اور خوشی خوشی اپنا دامن مراد بھر لیتا ہے۔ لوٹتے لوٹتے سعیم
 کی نگاہ ایک اونٹنی پر پڑتی ہے جس کو ایک ترش رو اور سخت دل حبشی
 غلام لئے جا رہا ہے۔ گو وہ کافی طاقتور اور تندرست ہے، مگر اس کا
 حوصلہ پست ہو چلا ہے اور بہت نے جواب دیدیا ہے۔ سفر کی تکلیفوں
 اور صعوبتوں نے اسے انتہائی لاغر کر دیا ہے اور اس ناگہانی
 آفت نے تو اس کی رہی سہی طاقت بھی ختم کر دی ہے۔ یہ اپنے
 مالکوں کے حکم کی تعمیل کر رہا ہے۔ اگرچہ اس کا دل کسی گوشہ عافیت
 کا متلاشی ہے۔ اگر دل کی بات مانتا تو بد بخت اونٹنی کو اس کے
 حال پر چھوڑ دیتا کہ جدھر چاہے چلی جائے اور جدھر مقدر کھینچ لے
 کھینچ جائے۔ سعیم جب اس بد قسمت اونٹنی کو غور سے دیکھتا ہے
 تو اس پر ایک بہترین اور نفیس محل نظر آتا ہے جس پر ریشمی پردے
 پڑے ہوئے ہیں جو ہیرے جو اہرات سے مرصع اور سونے کے تاروں
 سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ سعیم کے منہ میں دیکھتے ہی پانی بھر آتا ہے
 اور نیزہ لے کر غلام کی طرف دوڑتا ہے۔ غلام سعیم کے پیور دیکھتے
 ہی چپ چاپ اونٹنی کی تکمیل اُسے پکڑا دیتا ہے اور خاموش کان

دیباے سجیم کے آگے آگے چلنے لگتا ہے۔

سجیم بیسے کس کی اونٹنی ہے؟

غلام (ٹوٹی پھوٹی عربی میں) اس پر ہارس سردار ابرہہ کی بھانجی میں

سجیم اس اونٹنی اور غلام کو اپنے گھر کی طرف لا رہا ہے، اور

دل ہی دل میں کہہ رہا ہے، مالِ غنیمت میں یہ اونٹنی، یہ غلام اور

اس پر قیمتی لدا ہوا مال ہی مجھے کافی ہے، ابرہہ کی بھانجی سے مجھے

کوئی سروکار نہیں، اسے تو میں کسی قریشی سردار کو بطور سوغات

کے ہبہ کر دوں گا۔ سجیم اسی خیال میں ڈوبا ہوا جا رہا ہے اور غلام

بھی اس کے آگے آگے اونٹنی لئے جا رہا ہے۔ جب وہ اپنے قبیلے

کے خمیوں کے پاس پہنچ جاتا ہے تو سجیم غلام کو اونٹنی بٹھانے کا

اشارہ کرتا ہے۔ چنانچہ وہ اونٹنی بٹھا کر ذرا دور جا کر نیچی نگاہیں کر کے

کھڑا ہو جاتا ہے، جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز ڈھونڈ رہا ہو۔ پھر سجیم

غلام کو اشارہ کرتا ہے کہ محل اتار دے۔ چنانچہ غلام آکر اونٹنی سے

محل اتار دیتا ہے اور پھر تھوڑی دور جا کر نیچی نگاہ کر کے کھڑا ہو جاتا

ہے، جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز ڈھونڈ رہا ہو۔ سجیم آہستہ آہستہ محل

کے قریب آتا ہے اور آہستہ سے اس کا ایک پردہ اٹھا کر اندر ایک

سرسری نگاہ ڈالتا ہے اور پھر ہٹا لیتا ہے۔ اس کے چہرے پر شگفتگی

اور پشانت چھا جاتی ہے اور جذبات مسرت سے بے قابو ہو کر چیخ پڑتا ہے۔ رب کعبہ کی قسم یہ تو واقعی حمامہ ہے، خوبصورت پری چہرہ اور نازک اندام۔ اس کے حیرت و استعجاب کی انتہا نہیں رہی، کیونکہ وہ حسن و جمال کی ایک مورتی دیکھ رہا ہے، جو اگرچہ سالولی رنگ والی اور گندم گول سے مگر قدرت کا بہترین شاہکار ہی مناسب اعضاء سرگیں آنکھیں، معتدل القامت، نازک اندام، گل فام اور گلبدن ہے۔ نگاہوں میں جادو، ہونٹوں پر مسکراہٹ، بانگی ادائیں اور پری چہرہ ہے۔ غریب سہمی سہمی اور سر جھکائے بیٹھی ہے خوف و دہشت نے اسے گہرا رکھا ہے لیکن پھر بھی بڑے صبر و ضبط سے کام لے رہی ہے، اس کا وقار اور اس کی حیا پریشانی اور الجھن کی دلی کیفیات کا اظہار نہیں ہونے دیتے۔ گوا آنکھوں میں آنسو ہیں مگر آنکھیں بھی ظاہر نہیں ہونے دیتی اور پی جاتی ہے۔ اپنی اندرونی بے چینی اور بے قراری کو ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ مجھ پر ایک نگاہ اس پری پیکر بڑا دلالت ہے اور فوراً ہٹا لیتا ہے۔ اس کا چہرہ پھر مسرت سے چمک اٹھتا ہے اور زبان سے بے ساختہ نکل جاتا ہے "رب کعبہ کی قسم یہ تو واقعی حمامہ ہے، گل فام، نازک اندام اور پری چہرہ۔ پھر وہ بڑے ادب و احترام اور کمال شفقت و عزت سے اس کو محل

سے باہر نکالتا ہے، اور یہ بھی کہتا جاتا ہے۔ "بیٹی! گھبراؤ مت، فکر نہ کرو۔ میں تم سے بدسلوکی نہ کروں گا، تمہیں ذرہ برابر تکلیف نہ ہونے دوں گا۔ پھر اُس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ اپنے گھر لے جاتا ہے۔ دوشیزہ کو فرماں برداری کے سوا چارہ ہی کیا تھا، اس لئے وہ چارہ ناچار اُس کے حکم پر چلتی رہی۔ آخر کار اپنی بیوی کے پاس بے جا کر اُس سے کہتا ہے:

سچم (بڑی متانت سے) "اس حمامہ کو ابھی طرح رکھنا، کیونکہ ہمارا قبیلہ اس کے لائق نہیں ہے، اس کے لائق تو کوئی قریشی سردار ہی ہے۔" پھر دوسری بار مالِ غنیمت کے لئے نکلتا ہے، اور غلام، محل اور اوستنی کو محفوظ کر جاتا ہے، تاکہ قبیلے والوں سے جلے اور کچھ اور مال ہاتھ لگے۔

اس واقعہ کو ابھی ایک ہینہ بھی نہ گذرا ہوگا کہ سچم خلف بن وہب جمحی کے پاس اس کے سرِ راء والے زرعی کھیتوں میں جا پہنچتا ہے۔ اس سفر میں اس کے ساتھ اس کی نوگرقار شہزادی بھی ہے۔ سچم خلف کے مکان کے دروازے کے پاس اوستی بٹھا دیتا ہے، اور وہاں پھر جاتا ہے۔ عربوں کی اور خصوصاً

قریشیوں کی عادت کے مطابق خلف کے گھروالے اپنے بہان کی خوب خاطر تواضع اور آؤ بھگت کرتے ہیں۔ سحیم آداب و سلام سے فارغ ہوتے ہی عرض کرتا ہے :-

سحیم : اے جمح کے سردار! کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ میں آپ کے لئے کیا لایا ہوں!

خلف :- کوئی اچھی ہی چیز لائے ہو گے، نہیں نہیں بہترین ہی چیز لائے ہو۔
 سحیم :- میں آپ کی خدمت گرامی میں ابرہہ کی بھانجی لایا ہوں، جو کم بخت بیت اللہ ڈھانے کے لئے آیا تھا، اور رب کعبہ نے اسے انتہائی ذلیل و خوار کر کے شہر بدر کر دیا تھا۔

خلف : ابرہہ کی بھانجی!

سحیم : ہاں ابرہہ کی بھانجی!

خلف : اس کا کیا نام ہے؟

سحیم : معلوم نہیں، لیکن اس کا سر و قد، چھریا بدن اور اس کی ملاحظت دیکھ کر میں اسے حمامہ کہتا ہوں۔ میرے خیال میں ہمارے قبیلہ کا تو کوئی آدمی اس کے لائق ہے نہیں! اور جہاں تک میں نے نگاہ دوڑائی عرب میں بھی کوئی اس کے لائق نہیں، البتہ قریشی سردار ضرور اس کے لائق ہیں جو بیت اللہ کے نگراں اور

دیوتاؤں کی خیر خبر رکھنے والے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرے اولاد
آپ کے درمیان پرانے دوستانہ تعلقات ہیں۔ اس لئے میں آپ
کی خدمت میں یہ ناپیر تحفہ پیش کر رہا ہوں۔“

خلف سخیم سے اس کی قیمت پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ وہ بول پڑا،
سخیم: ”ابو امیہ! ذرا ٹھہریے، میں اس شہزادی کو بیچنے کی غرض
سے آپ کے پاس نہیں لایا ہوں، میں تو آپ کو اپنی طرف سے
ایک ناپیر تحفہ پیش کر رہا ہوں، جیسے کوئی دوست اپنے دوست
کو تحفہ پیش کیا کرتا ہے۔“

خلف:۔ شکر یہ! خدا تمہارا حسن سلوک قائم رکھے۔“

خلف کے پھرے سے خوشی، رضامندی اور شکر لے کے اسٹار
جھلک رہے ہیں۔ لیکن دل ہی دل میں یہ بھی سوچ رہا ہے کہ دیہاتوں
کے تحفے قبول تو کر لیے جاتے ہیں مگر ان کا ان سے بہتر بدلہ بھی دیا
جاتا ہے۔ پھر اس کے حکم سے شہزادی گھر میں پہنچادی جاتی ہے۔
خلف اسے ایک نگاہ غلط انداز سے بھی نہیں دیکھتا۔ اور نہ دیکھنے
کی خواہش ہی اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ پھر خلف تھوڑی دیر
تک سخیم سے بات چیت کرتا رہتا ہے جو عام طور سے میزبان اپنے
مہمانوں سے کرتے ہیں۔ پھر کافی دیر تک سر جھکا کر بیٹھ جاتا ہے جس

سے سچم کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا تحفہ اُس کے دوست کو اس کی خواہش کے مطابق پسند نہیں آیا، لیکن خلف سر اٹھا کر کہتا ہے :-

خلف: ”سچم! تمہیں معلوم ہے کہ آج جیسا احسان تم نے میرے ساتھ کبھی نہیں کیا، یقین جانو ہم نے آبرمہ سے جنگ نہیں کی نہ کوئی مزاحمت کی بلکہ ہم اس کی راہ سے ہٹ گئے۔ ہم نے بالاتفاق اعلان کر دیا کہ ہم بیت اللہ کے آس پاس سے الگ ہو جائیں، اور قریب ہی پہاڑوں کی گھاٹیوں میں جا چھپیں، اور گھر کی حفاظت گھر والے پر چھوڑ دیں۔ چنانچہ پروردگار عالم نے اپنا گھر بچا لیا، اور آبرمہ کو ذلیل و خوار کر کے دھتکار دیا، اس کے ہاتھیوں کی بھگدڑ اور اُس کے لشکر کی لپٹائی کا تماشہ ہم پہاڑوں کی چوٹیوں اور اُن کی گھاٹیوں سے دیکھ رہے تھے جہاں ہم چھپے ہوئے تھے۔ جب ہم سے دشمن ہٹ گیا تو ہم مکہ میں اپنے اپنے گھروں میں سلامتی سے پہنچ گئے۔ لیکن آج ہمارے دل تلملا رہے تھے اور اُن میں یہ حسرتیں بھل رہی تھیں کہ ہم نے اس مقدس گھر کا حق نہیں ادا کیا۔ کیونکہ ہر طرح کی نگرانی اور خیر خیر ہمارے ذمہ تھی۔ لیکن آج اس شہزادی کو میرے پاس لاکر

تم نے میری پیاس بجھانے کا سامان فراہم کر دیا۔ جب تم اسے لارے ہو گے تو خیال کر رہے ہو گے کہ میں اس سے بہت خوش ہو گیا لیکن اس گھر کے رب کی قسم جس کی ہم نے اڑے وقت حفاظت نہیں کی، میں تمہاری اس حبشی شہزادی کو اتنا ذلیل کروں گا کہ آج تک کوئی اس قدر ذلیل و خوار نہ ہوا ہو گا۔ سب سے بڑی یہ ذلت ہو گی کہ یہ مکہ کے حرم میں داخل نہ ہو سکے گی اور مقدس زمین پر نہ چل سکے گی، کیونکہ رب حرم نے اس نجاست کو حرم سے اور اپنے مقدس گھر سے نکال پھینکا ہے۔“

سحیحیم: ”ابوامیہ! افسوس اور صد ہزار افسوس! اگر مجھے پہلے سے معلوم ہوتا کہ تم اس خوبصورت شہزادی سے اس بُرے طریقے سے پیش آؤ گے، تو میں اسے اپنے ہی پاس رہنے دیتا تمہارے پاس ہرگز نہ لاتا، میں تمہارے خیالات سے متفق نہیں۔“

خلف: ”دہش کیا“ واہ سحیحیم، تم نے خوب افسوس کیا، یہ تو اس ذلیل برحق کا فیصلہ ہے جو اپنی قوت و اقتدار میں مجھ سے اور تم سے بڑی عظمت و عزت والا ہے۔ اس شہزادی کو حرم کے قریب رہ کر ذلیل و خوار ہونا چاہیے جسے اس کی قوم نے برباد کرنے کا ہتھیار لیا تھا اور اس کی بے حرمتی پر آمادہ ہو گئے تھے۔ خدا کی

جب تک میں زندہ ہوں یہ شہزادی آزادی سے محروم رہے گی،
اور کبھی آزاد پختے پیدا نہ کر سکے گی۔“

سبحانہ! ابوامیہ افسوس میں جب تم اپنے لئے اسے پسند نہیں کرتے
تو پھر مجھے واپس کر دو۔“

خلف: (ٹھٹھا مار کر) خوب خوب، سبحانہ خوب! میں تو اس کم بخت
کو تمہارے لئے بھی پسند نہیں کرتا۔ میں ہمد کر چکا ہوں کہ جب
تک میں زندہ ہوں اسے آزاد پختے نہ پیدا کرنے دوں گا۔ اس جگہ
میرے اونٹوں اور بکریوں کے ریوڑ ہیں جنہیں میرے غلام چراتے
ہیں، جن میں گورے اور کالے ہر طرح کے غلام ہیں، انہیں غلاموں
کے ساتھ یہ بد بخت شہزادی بھی میرے جالور چراتے گی۔“

سبحانہ ارادہ بھی کرتا ہے کہ اپنے دوست کی بعض باتوں کا جواب
دے، مگر خلف موضوع بحث ہی بدل دیتا ہے، اور سبحانہ کی توجہ ادھر
سے ہٹا کر عین کے حالات اور تہامہ و حجاز کے تازہ تازہ واقعات
کی طرف پھیر دیتا ہے۔

اس روز شام کو خلف اپنے آدمیوں کو کھانا تقسیم کر کے جب
گھر واپس آتا ہے تو اپنی اہلیہ کو بڑا افسردہ اور ادا اس دیکھتا ہے جب
پوچھتا ہے کہ کیا بات ہے تو کچھ جواب نہیں ملتا، البتہ وہ غمگین لہجے میں

صرف یہ عرض کرتی ہے :-

اُمّ اُمیہ: (منہ بسور کرنا) آپ اس نوجوان چھریے بدن والی حسین
دو شیزہ کے ساتھ کیا سلوک کریں گے جسے سحیم نے تحفے میں آپ
کو عطا کی ہے؟

خلف: ایوی کو اشتعال دلانے کے لئے "ام اُمیہ! یہ ابرہہ کی بھانجی
نے، شہزادی ہے، اس کی خوب خاطر تواضع کرو اور اسے ہر طرح کا
آرام پہنچاؤ۔"

ام اُمیہ (بھری ہوئی تو تھی ہی، پھوٹ پڑتی ہے اور زار قطار رو کر کہتی ہے)
"ہائے میرا کھٹا پھوٹ گیا، اب میری قسمت میں یہی رہ گیا ہے کہ میں
گستاخوں نالائقوں، اور حرم محترم کی توہین کرنے والوں کی خدمت کروں
اور انہیں کھلاؤں بلاؤں!"

خلف: ایوی کے سر پر ہاتھ پھیر کرنا "ام اُمیہ! غم نہ کرو، تم کیوں
روتی ہو، تمہیں کیا فکر ہے، میں نے تو تم سے مذاق کیا تھا، تمہیں
معلوم ہے کہ اس قسمت کی ماری شہزادی نے اب تک اپنی زندگی
میں عیش ہی عیش دیکھا ہے۔ جب سحیم نے مجھے یہ تحفہ دیا تھا تو
میں نے اسی وقت قسم کھالی تھی کہ آج سے یہ بدبخت عمر بھر ذلت
و خواری ہی دیکھے گی۔ حرم کی حمایت میں میری نکسیر بھی نہیں بھونٹی

میں نے سوچا اسی ترکیب سے میرے دل کی بھڑاس نکلے گی۔ آخر
اس نازک اور آڑے وقت کچھ تو اس کی حمایت کا ثبوت پیش کیا
جاسکے۔ لہذا میں اس کو حرم کی مقدس زمین پر قدم ہنسی رکھنے دوں گا،
اور اس سے عمر بھر بھڑبھڑیاں چرداؤں گا۔

اُمّ اُمیہ: پھر تو اسے میری خادمہ بنا دیجئے۔

خلف دہش کرا، تمہاری خدمت اس کے لئے ذلت نہ ہوگی، اس
سے اس کی تھوڑا ہی بے غرتی ہوگی۔

اُمّ اُمیہ: آپ اسے میری خادمہ بنا دیجئے، پھر دیکھئے گا میں اس
مردار کو کیسا مزہ چکھاتی ہوں۔

خلف، مگر میں نے تو یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ یہ سمرات والی اراضی میں
رہ کر غلاموں کے ساتھ میری بھڑبھڑیاں چرایا کیے گی، میں اس کو حرم
میں قدم ہی نہ رکھنے دوں گا۔ نہ یہ نجس و ناپاک مکہ کی مقدس
سرزمین پر چل پھر سکتی ہے۔ جب اس مقدس گھر کے رب نے اس
کی قوم کو مکہ میں نہ آنے دیا اور مکہ سے دور منیٰ میں چھوٹے چھوٹے
پرندوں سے تباہ کر دیا تو میں بھی اس کی مرضی کے خلاف نہ کروں گا
کہ اس کے ناپاک قدموں سے یہ ارض مقدس پامال کراؤں۔ خواہ
یہ کسی کی خادمہ ہی کیوں نہ ہو۔

امم امیہ (خوش ہو کر) اے قریش کے لائق سردار! آپ سرداری
 ہی کے لائق ہیں، اسی لئے قریشیوں نے آپ کو سردار چنا ہے۔
 خلف کا جیش لونڈی سے ایک غلام ہے جس کو رباع کہا جاتا ہے

اس کی عمر تقریباً بیس برس کی ہے۔ یہ بڑا ذہین، طباع، ہوشیار
 و چالاک، کام میں ماہر اور دور اندیش ہے۔ اُس نے اپنی لائق
 خدمات سے خلف کو اس قدر خوش کر دیا ہے کہ وہ اُسے آزاد کر دیا
 ہے، اور اپنی مسرات والی اراضی کا منتظم بنا دیتا ہے، دوسرے
 روز صبح ہوتے ہی خلف رباع کو بلاتا ہے اور کہتا ہے:-

خلف: (مسکرا کر) رباع! تمہیں معلوم ہے کل میرے پاس تمہارے
 کسی امیر کی ایک امیرزادی لائی گئی ہے، تمہیں اپنی قوم کی گستاخی،
 کینگی اور ذلیل حرکتیں معلوم ہی ہیں، اسی بنا پر میں نے یہ تہیہ کر لیا
 ہے کہ میں اس امیرزادی سے بیٹے بکریاں چرواؤں، کیا میں اس
 کو تمہارے حوالے کر دوں کہ تم اس کجخت کو ذلیل و خوار رکھو اور
 یہ جس ذلت کے لائق ہے وہی ذلت اسے پہنچاؤ۔

رباع: قابل احترام سردار! پیر آپ کو کس بات کا انتظار ہے۔ آپ
 ہر قسم کے غلام کے ساتھ میرا معاملہ دیکھ چکے ہیں، کیا میں اپنی ہوشیاری
 اور حسن تدبیر سے انہیں آپ کی انتہائی اور پُر خلوص خدمات پر

آبادہ نہیں کر دیتا، اور ان سے قسم قسم کے کام نہیں لے لیتا؟
 خلف :- ٹھیک ہے میں تمہاری یہ بات مانتا ہوں۔ اچھا اس امیر
 زادی کو لے جاؤ اور اسے چرواہوں کا لباس پہنا دو اور اس سے بھیڑ
 بکریاں چرواؤ۔

رباح :- لیکن میری ناقص رائے میں اس کام سے یہ ذلیل و خوار
 نہ ہوگی۔ البتہ میں آپ کو ایک رائے دیتا ہوں، اس پر عمل کر کے شاید
 آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں!
 خلف :- بناؤ کیا ہے؟

رباح :- یہ تو آپ خوب جانتے ہی ہیں کہ میں نہ تو حبشہ کا امیر
 ہوں اور نہ سردار، بلکہ عام لوگوں کی طرح ایک معمولی آدمی ہوں، میری
 رگوں میں حبش کا خون ہے، اگر میں آپ کے ملک میں نہ لایا گیا ہوتا
 تو میں اس امیر زادی کے قہر شاہی میں ملازمت کو بھی گوارا نہ کرتا۔
 خلف (مسکرا کر اور خوش ہو کر): کیا تم اُسے اپنی بیوی بنانا چاہتے ہو؟
 رباح :- اگر آپ اس کو ذلیل و حقیر سی بنا کر رکھنا چاہتے ہیں، تاکہ اس
 کی وجہ سے حبشہ کے امراء اور رگوں ساء کی بھی ناک کٹ جائے، تو
 اُسے اپنے زنجی غلام سے بیاہ دیجئے۔

خلف :- چلو مجھے منظور ہے، آج سے تم اُس کے شوہر ہو۔ دن پڑھے

شوق سے اپنی بیوی کو آکر لے جانا۔“

آج رباح خلف کے ساتھ چالاکی اور بڑی دور اندیشی سے کام لیتا ہے۔ شاید آج سے پہلے رباح نے اپنے مالک سے کبھی چال بازی اور دھوکہ نہ کیا ہوگا، اور اس سے جھوٹ بول کر اپنی مکارانہ چال سے اپنا کام نہ نکالا ہوگا۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ رباح کو درپردہ یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ خلف اس بیماری مصیبت زدہ امیرزادی کو ذلیل و خوار کرنا چاہتا ہے۔ اسے شہزادی کے مرتبہ کا حال خوب معلوم تھا۔ خلف کی یہ حرکت اسے شاق گذری، اور اس نے انتہائی بڑی نگاہ سے اسے دیکھا، رباح نے بھی اپنے دل میں اس بات کا تہیہ کر لیا کہ مقدور بھر شہزادی پر آنچ نہ آنے دے گا، اور اپنی حسن تدبیر سے اسے صاف بچالے گا۔ جب اس نے اس سلسلے میں خوب غور و فکر کیا اور بار بار دماغ پر زور ڈالا تو اس کی سمجھ میں اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ آئی کہ اسے بیوی بنا کر اپنے غریب خالے لے آئے اور شہزادی بنا کر اسی مقام پر رکھے جس مقام کی وہ حقدار ہے۔ جب وہ اپنی تدبیر میں کامیاب ہو گیا تو خوشی سے پھولانہ سمایا اور اسے پورا اطمینان ہو گیا کہ اب شہزادی پر ذرہ برابر آنچ نہ آنے دوں گا، اور اسے اپنی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں لا کر اس کا

وہی ادب و احترام بجا لاؤنگا جس کے وہ لائق ہے، اور اس آڑے اور نازک وقت میں پوری ہمدردی کی مستحق بھی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اپنے جذبات اس کے جذبات میں ملا دوں گا اور اسے اپنے گھر کی مالکہ نہیں بلکہ ملکہ بنا کر رکھوں گا۔ البتہ دل کی اسے مالکہ بنا دوں گا۔ شاید کل حالات سازگار ہو جائیں اور شہزادی کی پتا کے ایام گذر جائیں۔ آخر راج اپنی شہزادی کو بڑی مسرت سے اپنی حقیر جھوپڑی میں لے آتا ہے اور اس نازنین کو یہاں ٹھہرا دیتا ہے اور حتی الامکان اس کی دلجوئی اور خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے اس کا احترام برقرار رکھتا ہے، اس کی انتہائی قدر و منزلت کرتا ہے اس کا دل میلا نہیں ہونے دیتا، اس کے ساتھ انتہائی ہمدردی سے پیش آتا ہے، کمال محبت و پیار سے دیکھتا ہے، ہر طرح کی خاطر تواضع کرتا ہے، صبح ہے تو اس کی منت سماجت اور شام ہے تو اس کی ہاتھ چھاؤں دن ہے تو اسی کی خاطر داری اور رات ہے تو اسی کی ناز برداری کوئی ایسی بات نہیں ہونے دیتا جس سے شہزادی کے دل پر طال آئے یا اسے رنج پہنچے یا اسے تکلیف ہو، یا اس کا دل دکھے، ہر وقت اسے خوش کرنے کی فکر اسے ہنسانے کی تمنا اس کے غم غلط کرنے کی آرزو اور اسے ہنس مکھ دیکھنے کی

خوابش رات کو سوتے وقت دروازے کے باہر چار پائی ڈال کر
 پڑ جاتا ہے اور رات کو یا تو سو کر یا اس کے خوش کرنے کی فکر میں
 غلطاں و پیچاں رہ کر گزار دیتا ہے۔ شہزادی کو اپنی محبت کی ملکہ
 کو، اپنی جائز بیوی کو اور اپنی رفیق زندگی کو ہاتھ نہیں لگاتا،
 بلکہ اُس کے پاس جانے کو بھی پسند نہیں کرتا، وہ ایک شہزادی ہے
 اونچے مقام والی ہے، محلوں میں پنی بڑھی ہے نازک اندام ہے
 پری چہرہ ہے، میں ایک غلام ہوں، حقیر ہوں، ادنی ہوں، ایک
 معمولی شخص ہوں اور دوسروں کا دست نگر ہوں۔ قسمت نے
 اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدیا ہے۔ اب میرا فرض ہے کہ اس
 کی خدمت بجالاؤں، اس کی ضروریات پوری کروں، اسے خوش و
 خرم رکھوں، اُس کے پاس غم نہ آنے دوں اور ہر وقت اس کی
 ہاتھ چھاؤں کرتا رہوں۔ اس نقطے سے آگے بڑھنا نا فرض شناسی
 اور شرافت سے بعید ہے۔

مصیبت زدہ شہزادی انتہائی ذلت و خواری میں مبتلا رباح
 کے پاس آئی تھی، اس کے اشاروں پر چلنے کو تیار تھی اور اُس کی
 ہر خدمت بجالانے پر آمادہ تھی مگر جب اس گھر میں اُس نے اپنا
 ادب و احترام دیکھا، اپنی قدر و منزلت دیکھی، اپنی خاطر و تواضع دیکھی

اپنی ہر قسم کی قدر دانی دیکھی، اور اپنی محبت و ہمدردی دیکھی تو اس کے دل کو اطمینان نصیب ہوا، اس کی پریشانی دور ہوئی اور اس کا افسردہ چہرہ ذرا کھلنے لگا۔ رفتہ رفتہ رباح کی محبت بھی اس کے دل میں گھر کرنے لگی، اس کے دل و دماغ پر چھانے لگی اور اسے پرکیف و مسرور بنانے لگی، آخر وہ رباح سے عاجزی کے ساتھ اس طرح بات کرتی جیسے کوئی لونڈی اپنے مالک سے کرتی ہے رباح جب اس کی توجہ اس کی محبت اور اس کی ہمدردی دیکھتا تو پھولے نہ سماتا، اس کی اور بھی جاہت بڑھ جاتی اور اس کی حرمت و توقیر اور بھی زیادہ کرنے لگتا، اس قدر ہمدردی اور محبت پیار سے صرف یہ غرض تھی کہ شہزادی کو غلامی کے بوجھ کا احساس نہ ہو اور اگر ہو بھی تو کچھ یوں ہی سہا تاکہ وہ اسے آسانی سے برداشت کر سکے۔ لیکن لوگوں کے حالات و واقعات ان کی تدابیر و مساعی کا ساتھ نہیں دیتے۔ بلکہ یہاں الٹی گنگا بہتی ہے انسان کا چاہ کبھی نہیں ہوتا۔ رباح نے تو ہتھیہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی شہزادی کے ساتھ بالکل اسی طرح زندگی گزار دیکھا جس طرح ایک خادم اور ایک غلام اپنی بلند مرتبہ ستیدہ کے ساتھ گزار دیتا ہے جو اس کے سیاہ و سفید کی مالک ہوتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ

یہ شادی محض خلت کو دھوکا دیکر اسے اس کے ارادے سے
 بازر کھنے کے لئے بیاہی گئی ہے۔ جو اس بیکن شہزادی کی
 بری گت بنانا چاہتا تھا، مانا کہ ایک غلام پر اپنے آقا کی ہمدردی
 مقدر بھر فرض ہے۔ اس کی پُر خلوص خدمت بھی فرض ہے
 اور بہترین اور عمدہ طریقے سے اس کے مال کی نگرانی بھی واجب
 ہے۔ رباح میں یہ ساری خوبیاں تھیں، وہ اپنے حسن انتظام
 اور لائق تدبیروں سے خلت کا مال بڑھاتا رہتا تھا اور بہترین انتظام
 میں لگا رہتا تھا۔ مگر رباح نے اس شہزادی کے بارے میں اپنے
 فرائض کا لحاظ نہیں کیا، شہزادی پر آنچ نہ آنے دی، اور اپنی
 کمال ہوشیاری سے شہزادی کو ذلیل ہونے سے بچالیا۔ درخت
 اپنے بل گرتا ہے۔ قوی عصیبت نے رباح کو بھی فرض شناسی
 سے روک دیا۔ دراصل تھی بھی وہ ہمدردی کی حقدار قوم کا گناہ اس
 بے چاری کے سر تھوپنا انصاف سے بعید ہے۔ پھر اس کے مرتبے
 کا لحاظ بھی ضروری ہے جو اسے اپنے ملک میں حاصل تھا۔
 ان دونوں کے تعلق کی نوعیت عجیب و غریب ہے، سردارانِ
 قریش اور رباح کے ماتحت غلاموں کی نگاہ میں تو دونوں میاں
 بیوی ہیں، لیکن رباح کی نگاہ میں خادم و مخدوم ہیں۔ گو رباح یہ بات

ظاہر نہیں ہونے دیتا اور دل ہی دل میں چھپا کے رکھتا ہے، مگر شہزادی اُس کے ارادے کو بھانپ جاتی ہے اور انتہائی مسرت کے ساتھ اس کے ساتھ رہنے سے لگتی ہے۔ شہزادی رباح کے اس رویہ سے بڑی خوش تھی اور اس کے اس سلوک کو دل میں چھپا کر رباح کے ساتھ مالکانہ حیثیت سے رہتی تھی، رباح کے دل میں بھی یہی جذبہ کار فرما رہا، اور شہزادی نے بھی اس کی قدر کی اور اُس نے خوشی خوشی رباح کو قبول کر لیا۔ اس کا اطمینان قلب غبطہ کی حد تک پہنچ گیا۔ اور اس کے دل میں بھی رباح کی محبت گھر کرنے لگی۔ رباح نے اس کے جذبات میں اپنے جذبات پیوست کر دیئے۔ اس کی رضا کو اپنی رضا پر مقدم رکھا۔ صبح ہے تو اس کی رضا و طاعت میں لگا ہوا ہے اور شام ہے تو اسی کے خوش کرنے کی فکر میں ڈوبا ہوا ہے۔ دن بھر اس کی خدمتیں بجا لانا اور رات بھر اس کے لئے جاگ جاگ کر کاٹنا اس کا ایک محبوب مشغلہ ہے۔ شہزادی شروع شروع میں تو رباح کی خدمت گزار ہی اور اطاعت کو اپنا حق سمجھتی رہی لیکن غور و فکر کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ تو محض ایک لونڈی ہے۔ بھلا ایک لونڈی کا کسی پر کیا حق ہو سکتا ہے

بلکہ اسی پر اپنے آپ کے حقوق ہیں یا پھر آقا کی طرف سے کچھ حقوق اس غلام کو دئے ہوئے ہیں جو اس کا شوہر ہے۔ جب وہ اس معاملے میں خوب غور کرتی ہے تو رباح سے پہلو پکاتی ہے اور اس سے کتراتنی ہے۔ مگر بار بار غور کرنے سے اور رباح کے احسانات یاد کرنے سے اس کے دل میں رباح کی محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف کھینچنے لگتی ہے۔ مگر اسے بار بار اپنی غلامی اور بے بسی کا اور رباح کی نوعیت و حریت کا خیال آتا۔ وہ دل ہی دل میں سوچتی کہ معاملہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ میں اپنے قصر شاہی میں آزاد و خود مختار تھی اور آج دوسروں کی دست نگیروں رباح کل غلامی کے پنجے میں گرفتار تھا اور آج بھی گو آزاد ہے مگر خود مختار نہیں۔ پھر رباح سے بچنا چاہتی مگر اس کے عظیم احسانات اس کی بے مثال ہمدردی، اس کا حسن تدبیر سے صاف بچا کر نکال لانا، اور اس پر آنی نہ آنے دینا یہ سارے خیالات یکے بعد دیگرے اس کے ذہن میں آتے ہیں۔ رباح کی سفارش کرتے ہیں اور چیخ چیخ کر کہتے ہیں کہ اب رباح کے سوا تیرا کون ہے۔ کون تجھ سے محبت اور دل سوزی سے پیش آنے والا ہے، اور کون تیری ہمدردی کرنے والا ہے۔ آخر کار شہزادی کو مجبوراً ہتھیار ڈالنے پڑتے ہیں اور وہ راضی

زیادہ قضا ہو جاتی ہے۔

جدا ہوں ملک سے ہم اور نہ ہوں رقیب جدا

سے اپنا اپنا مقدر جدا، نصیب جدا

قسمت کا کوئی ساتھی نہیں، نہ معلوم مقدر کہاں کہاں کی ٹھوکریاں

کھلائے اور آئندہ کیا کیا کھلیں۔ رفتہ رفتہ رباح کی محبت اس

کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے اور پھر محبت کا یہ عالم ہوتا ہے

کہ اُس سے اس کا ایک منٹ کے لئے جدا ہونا گوارا نہیں ہوتا۔

ذرا بھی وہ آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے تو وہ بے چین و بے قرار

ہو جاتی ہے۔ اور رباح اس کی آنکھوں ہی آنکھوں میں پھرتا ہے

اور وہ کھوئی کھوئی سی اور اُداس سی نظر آنے لگتی ہے۔

اسی طرح دن بیتے، ہفتے گزرے، مگر رباح کے خلوص میں

کمی نہ آئی۔ وہ بدستور خدمت گزار ہی اور اطاعت شعاری کے

فرائض بجالاتا رہا، اب شہزادی انتہائی نازک اور بے قرار دور

سے گزر رہی ہے، وہ مجبور ہے کہ رباح سے زیادہ اس کے دل میں

رباح کی محبت ہو، بلکہ اس کی تو یہ خواہش ہے کہ اس طویل عرصے

میں ہم آپس میں جس قدر ایک دوسرے کے قریب آئے ہیں، اب

اور قریب آئیں۔ اس کی تو یہ تمنا تھی کہ یہ جو ہمارے آپس میں

بیکار کی گہری گہری خلیجیں حائل ہو گئی ہیں کسی طرح انہیں پاتا جائے
یہ جو تکلف کے پردے پڑ گئے ہیں انہیں بھاڑ دیا جائے، اور یہ جو
اجنبیت کی دیوار کھڑی ہے کسی نہ کسی طرح اسے گرا دیا جائے
اور اس کی تو یہ دلی آرزو تھی کہ آپس میں قریب سے قریب تر
ہو جائیں، بلکہ قرب کی بھی سرحد پار کر جائیں۔ طالب و مطلوب کی طرح
رہیں۔ ہم گہرے رفیقوں کی طرح آپس میں بولیں چالیں۔ لیکن افسوس
یہ گہری خلیج کون پاٹے۔ یہ دینر پردہ کون بھاڑے، اور یہ اُوچی
دیوار کون ڈھاکے۔ شہزادی رباح سے ہر طرح خوش ہے اُسے
دیکھ کر اُس کے لبوں پر مسکراہٹ آتی ہے مگر بھاری گوشہ نشین
مسکراتے بھی نہیں دیتی۔ دل ہی دل میں مسکراتی رہتی ہے۔ مگر
باوجود ان تمام باتوں کے جب رباح آتا جاتا یا بات کرتا ہے تو وہ
اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہتی ہے۔ یہ غضب کی نگاہیں
رباح کے دل و دماغ میں اتر جاتی ہیں اور دونوں کو مسرت و انبساط
سے بھر دیتی ہیں۔ رباح مسرت کے مارے بھولا نہیں سماتا۔ مگر اس
حد سے آگے نہ بڑھتا۔ رباح کے دل میں آج تک کبھی یہ آرزو
پیدا ہی نہیں ہوئی کہ وہ حال میں یا مستقبل میں کبھی شہزادی کے
ساتھ ایک شوہر کی حیثیت سے رہے گا۔ اُسے اس بات کا وہم و گمان

بھی نہ تھا کہ خلیجوں کا پٹ جانا، پردوں کا پھٹ جانا اور دیوار کا
 گر جانا ممکن ہے۔ یا وہ اسے کبھی لالچ بھری نگاہوں سے دیکھ بھی سکتا
 ہے۔ اُس کے گمان میں حمامہ تو تختِ شاہی پر رونق افروز ایک
 شہزادی ہے جس تک نگاہیں تو اٹھ سکتی ہیں مگر اس کے حریمِ ناز
 میں کسی اور چیز کا گزر نہیں۔ جب اُس کے حریمِ ناز تک دلی خواہش
 کی بھی رسائی نہیں تو قہروں کی کس طرح رسائی ہو سکتی ہے۔ ان دونوں
 کا تعلق ایک عجیب و غریب نوعیت کا بن گیا، اور ان کا باہمی رشتہ
 سرحدِ محبت پار کر کے ادب و احترام کی مملکت میں داخل ہو گیا دنیا
 کی نگاہ میں دونوں میاں بیوی تھے۔ آئین کی رو سے دونوں
 میاں بیوی تھے اور رہنا سہنا بھی میاں بیوی کا سا تھا، لیکن رباح
 اپنی شاہزادی کو بیوی سے بڑھ کر سمجھتا تھا۔ اگر طالب اپنے مطلوب
 کے دل سے پوچھے تو اس کا دل تو یہی کہتا ہے کہ باہمی رشتے کی
 حد سے آگے نہ بڑھا جائے۔ حمامہ کو بیوی بننے سے زیادہ کسی
 چیز کی آرزو نہ تھی لیکن افسوس بیوی بن کر رہنا اس کے اختیار
 میں تھوڑا ہی تھا۔ وہ رباح کے رحم و کرم پر تھی، اگر رباح چاہے
 تو اسے اپنی بیوی بنالے نہ چاہے تو کسی پر دور و زبردستی نہیں
 رفتہ رفتہ اس صورت حال نے ایک نئی کروٹ لی۔ حمامہ تو رباح

کی دل و جان سے عاشقِ ناز تھی، اور رباح اپنے آپ کو اس قابل
 ہی نہیں سمجھتا تھا بلکہ حقیر سمجھتا تھا، ادھر سے تو صدر کے حبیب
 لک اور ادھر دامن بچا کر بھاگنے پر آمادگی تو ادھر سے حد کے
 اندر رہنے کا مطالبہ اور ادھر سے سرے سے حد میں آنے ہی سے
 انکار۔ کبھی کبھی تو رباح کے اس مجبور پر اُسے حیرت ہوتی لیکن افسوس
 زبان ہی نہیں کہے تو کیونکر کہے۔ رباح کے اس غیر فطری رویہ سے
 حمامہ بدظن ہونے لگی اور اُسے معرور و خود پسند سمجھنے لگی محبت
 اور ہزار بدگمانی۔ رباح کے دل میں وہی احترام و اکرام کے جذبات
 موج زن تھے۔ لیکن ان کا یہ موقع اور محل نہ تھا، ضرورت حمامہ
 کے دل تھامنے اور آرزو بھانپنے کی تھی۔ اگر رباح خدمت گزار
 اور اطاعت شعار بن کر نہ رہتا اور حمامہ اس کے احسانات کی
 قائل نہ ہوتی تو ان کے تعلقات میں اس مقام پر آکر یقیناً کشیدگی
 ہو جاتی۔ جب محبت پورے عروج و شباب پر ہوتی ہے تو اس میں
 جتنی جلدی بگاڑ پیدا ہوتا ہے کسی اور چیز میں نہیں ہوتا۔ خصوصاً
 اس صورت میں جبکہ تکمیل مقصد میں خواہ مخواہ دشواریاں حاصل
 ہو جائیں، اور بلاوجہ کی رکاوٹیں پیدا ہونے لگیں۔ دیکھتے دیکھتے
 حمامہ کا دل اُکٹانے لگا، وہ ملول و کبیدہ خاطر رہنے لگی، اُس کے

لبوں کی مسکراہٹ جاتی رہی اور وہ خاموش اور چپ چاپ رہنے لگی۔ اُس کے مزاج میں چڑچڑاپن آگیا، بات بات پر بگڑ جاتی، ذرا ذرا سی بات میں طیش میں آ جاتی اور بد اخلاقی سے پیش آتی۔ جس کا خود اسے بھی احساس تھا۔ جب رباح نے اس بدے بدے ماحول کو دیکھا اور اُسے اُس کی کشیدگی، اُس کی اکتاہٹ اور چڑچڑاپن محسوس ہوا تو وہ یہ سمجھا کہ شاید کچھ خاطر تواضع میں یا ادب و احترام میں کمی ہو گئی ہے۔ جس کی وجہ سے حمامہ چپ چاپ اور بھری ہوئی رہتی ہے۔ اُس نے لطف و کرم اور محبت و پیار میں اور اضافہ کر دیا، اور اب خاص اہتمام سے اس بات کا خیال رکھنے لگا کہ حمامہ کے دل پر میل نہ آنے پائے اور خوش رہے۔ مگر

مریضِ عشق پر رحمتِ خدا کی

مرضِ بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

حمامہ کے دل پر اور بار رہنے لگا۔ وہ اور دل ہی دل میں گھٹنے لگی۔ جب پانی سر سے اترنے لگا اور رباح کی حالت میں بہرہ و فرق نہ آیا تو مرتا کیا نہ کرتا حمامہ تنگ آ کر کہنے لگی، حمامہ! آپ کا لطف و کرم دن بدن بڑھتا ہی جا رہا ہے، غالباً

اس سے آپ کا مقصد میرے ساتھ حسن سلوک ہے۔ مگر افسوس
 آپ نے خیال نہیں کیا کہ آپ کا یہ حسن سلوک میرے ساتھ بدسلوک
 ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مجھے ان تمام باتوں کے علاوہ کسی اور
 چیز کی بھی ضرورت ہے۔ افسوس آپ کو میری اس ضرورت کی
 احساس نہیں۔

ریاح، اداہانی مسکینی اور عاجزی سے کسی چیز کی ضرورت! بتاؤ
 سہی، آخر کس چیز کی ضرورت ہے، میں تمہاری آدمی آواز پر اسے
 پورا کرنے کو تیار ہوں۔

حمائمہ: (دل خراش اور طنز یہ لہجے میں) "آپ جانتے ہیں کہ آپ تو
 ہیں اور میں....."

ریاح، (بیچ میں دخل دے کر) نہیں نہیں، میں بھی نیا نیا آزاد ہوں
 ہوں۔ آج سے دو سال پہلے میں بھی غلام ہی تھا۔

حمائمہ:۔ دو سال پہلے غلام تھے خیر، اب تو آپ آزاد ہیں، میں
 غلام تو نہیں؟ اب تو گردن میں غلامی کا پتہ نہیں؟ اچھا دیکھیے آپ اس

کھانٹ سے آپ مجھ سے اونچے رتبے والے ہیں اور مجھ پر آپ کی
 فوقیت حاصل ہے۔ بہر حال اس وقت آپ مجھ سے اچھی اور بہتر حالت

میں ہیں۔ پھر یہ عاجزی، یہ انکساری، یہ احساس کمتری اور یہ مسکینی کیسے

جس کا آپ ایک عرصے سے اظہار فرماتے چلے آ رہے ہیں، حالانکہ آپ اس بات کا حق رکھتے ہیں، غرور و کبر کا نہیں بلکہ موجودہ حالت پر غور کرنے کا یا آئندہ حالت پر غور کرنے کا اب تو آپ حال و مستقبل کو مد نظر رکھیں۔ ماضی کے رنگین خواب گذر چکے، انھیں یاد دلا کر خدا کے واسطے میرا غم تازہ نہ کریں، وہ زمانہ لہ گیا، آہ وہ سنہرے دن گذرے ہوئے زمانہ کی طرح گذر گئے۔ اب تو وہ رنگین زمانہ خواب و خیال میں بھی نہیں، ساری سبھا لٹ گئی میں دکھیا رہی غم سہنے کے لئے رہ گئی۔ خیر اس قصے کو چھپ کر میرا دل نہ دکھائیں۔ اب تو میری حیثیت ایک لونڈی کی سی ہے۔ افسوس مجھے آزادی بھی نصیب نہیں، آپ خیر سے آزاد ہیں۔ اس قرقِ مراتب کے باوجود آپ نے مجھے اپنی رفیقہ حیات چنا ہے۔

رباح میں نے تمہیں اس لئے رفیقہ حیات چنا تھا کہ کوئی بداندیش تمہارے دشمنوں کو تکلیف نہ پہنچا سکے اور تم آنے والی بھیانک آفت سے محفوظ رہ سکو۔

جمامہ: ٹھیک ہے، اس احسان کا ہزار ہزار شکر یہ، وہ احسان آپ کر چکے، اب چونکہ میں آپ کی..... بیوی ہوں..... ہمارے..... تعلقات.....

یہ سن کر رباح کی آنکھوں میں آنسو بھرا آئے اور ٹپ ٹپ
 زمین پر گرنے لگے۔ نہ معلوم یہ آنسو مسرت کے تھے یا غم و رنج
 کے، اور حمامہ کا چہرہ ارغوانی ہو گیا نہ معلوم شرم و حیا سے یا مسرت
 و کامرانی سے، کیونکہ آج وہ ان گہری خلیجوں سے پار ہو چکی ہے
 جو اُس کے اور اُس کے شوہر کے درمیان حائل تھی۔ آج اُس نے
 وہ پردہ چاک کر دیا ہے جو طالب و مطلوب کے رشتے میں حائل
 تھیں۔ اور اُس نے وہ دیوار ڈھا دی ہے جو عاشق و معشوق کے
 درمیان کھڑی تھی۔

شکر لے آئے التجا کے
 کفر ٹوٹا خندا بخدا کر کے

ایک دن خلف اپنی سرات والی زرعی اراضی دیکھنے کے لئے
 آتا ہے، کچھ دنوں پہاں قیام کر کے یہاں کے حالات کا جائزہ لیتا
 ہے۔ یہاں کے حالات و واقعات معلوم کرتا ہے اور رباح سے
 انتظام کے بارے میں بات چیت کرتا ہے۔ سب کام اپنی مرضی
 کے مطابق دیکھ کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ اور تمام حالات ٹھیک پا کر
 رباح کی تعریف کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ زمین کا بہترین انتظام ہے

مال کی کثرت ہے، غلہ کی فراوانی ہے۔ ربّاح کی دیانت و امانت
 میں بال برابر شک کی گنجائش نہیں۔ ان تمام باتوں سے خلف
 اس قدر خوش ہوتا ہے کہ دل ہی دل میں سوچتا ہے کہ کام قابل انعام
 ہے۔ ربّاح کے ساتھ احسان کیا جائے اور اُس سے انعام دیا جائے
 چنانچہ ربّاح کو انعام میں کچھ اونٹ کچھ بکریاں اور کچھ زمین کی پیداوار
 بخشتا ہے۔ ربّاح انعام لے کر مالک کا خوب خوب شکر ادا کرتا
 ہے۔ اور تعریفیں کر کے اپنے مالک کو خوش کر دیتا ہے۔ ربّاح یہ
 انعام لے کر خوشی خوشی جانے والا ہی تھا کہ خلف اُس سے پھر الٹا
 ہے، انتہائی شیریں انداز میں ربّاح سے مذاق کرتا ہے اور دل لگی
 کے طور پر اُس سے پوچھتا ہے۔

خلف: "ربّاح! بتاؤ تو سہی، تم دونوں میں بانجھ کون ہے۔ میں نے
 ایک عرصہ ہوا تمہارے حوالے حمامہ کی تھی۔ لیکن تمہاری اولاد ہی
 نظر نہیں آتی۔"

ربّاح خلف کی یہ بات سن کر طیش میں آ گیا۔ شرم نے اس کی
 زبان پر گرہ لگا دی، اُس نے سر جھکا لیا اور آنکھیں نہچی کر لیں۔ لیکن
 خلف بار بار سہنس سہنس کر اُس سے یہی پوچھتا رہا۔

خلف: "سنئے نہیں ربّاح، تم دونوں میں کون بانجھ ہے؟"

اب رباح کو جواب دینے کی کچھ جرات و ہمت ہوئی اور کچھ خودداری کا بھی پاس تھا۔

رباح (بے باک و نڈر ہو کر) آخر آپ کو اس سے کیا، خواہ ہم بائچہ ہوں یا اولاد والے۔ (رباح کا یہ کورا جواب سن کر خلف کو ذرا طال ہوا اور بات کا پہلو بدل کر کہنے لگا۔)

خلف: "رباح! ذرا قوت برداشت سے کام لو، اگر تم آزاد ہو تو کیا بے تمہاری حمانہ تو میری ہی لونڈی ہے، مجھے اس کی فکر نہ ہوگی تو کس کو ہوگی؟"

رباح: (طیش میں آ کر) اچھا... اسی لئے آپ نے اسے میرے حوالے کیا تھا تاکہ آپ بھیٹر بکریوں کی طرح اس سے بچے پیدا کر سکیں؟

خلف: "رباح! تم تو غصے ہو گئے، میں تمہیں اذیت دینا نہیں چاہتا تھا میں تو دوستانہ طریقہ سے تمہارا حال معلوم کر رہا تھا۔"

رباح: "اگر یہی بات ہے جس کا تم نے اظہار کیا ہے تو شوق سے جو چاہو پوچھو۔" (رباح کو کچھ خیال آتا ہے، اپنا سر پیٹ لیتا ہے اور درد انگیز لہجے میں کہتا ہے: "ہائے ہائے، یہ بات تو مجھے یاد ہی نہ رہی کہ وہ لونڈی ہے اور اس کا بچہ بھی اسی کی طرح غلام ہی رہے گا۔"

خلف: (تعجب سے) رباح! کیا تمہارا بیٹا بھی ہے؟

رباح :- ہاں ہاں، ہمارا بیٹا بھی ہے، اگر میں اپنے دل کا کہنا مانتا
 اور حمامہ بھی راضی ہوتی تو میں اُسے کبھی کا زندہ درگور کر چکا ہوتا۔
 جیسے تم لوگ اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیتے ہو۔ یہ بات
 مجھے انتہائی ناپسند ہے کہ انسان سے بھیڑ بکریوں کی طرح نسل
 کشی کرائی جائے اور اُس سے بچے حاصل کئے جائیں۔“
 خلف : (زندہ اور غمگین ہو کر) رباح ! افسوس تم بیکار مجھے دکھ
 پہنچا رہے ہو، اور خود اپنے دل کو بھی دکھا رہے ہو۔ خدا کی
 قسم میں نے تم سے نہ تو نسل کشی کا ارادہ کیا اور نہ بھیڑ بکریوں
 کی طرح بچے پیدا کرانے کا۔ تمہیں یاد ہو گا میں نے تم سے
 یہ کہا تھا کہ اس حمامہ کو دیگر چرچا ہوں کے ساتھ رکھو، اور
 اس سے جاؤز چرانے کا کام لو۔ مگر تم نے یہ خواہش کی کہ حمامہ
 تمہاری بیوی بنا دی جائے جس سے اس کی انتہائی ذلت ہوگی
 جو میرا عین فحشا ہے۔ اب کیوں نیلے پیلے ہوتے ہو اور کیوں
 طیش میں آتے ہو۔“

خلف کی یہ باتیں سن کر رباح دم بخود رہ گیا۔ اُسے ایک
 ایک کر کے ساری پھلی باتیں یاد آنے لگیں، پہلے یہ بات ذہن میں
 آئی کہ شہزادی کو ذلیل کرنے کی اسکیم بنائی جا رہی تھی۔ میں اپنی

عسین تدبیر سے اس پر آنچ نہیں آنے دیتا۔ پھر اُسے یاد آیا کہ اس موقع کے علاوہ کبھی اُس نے اپنے مالک سے دھوکہ نہیں کیا۔ لیکن اُس وقت دھوکہ کرنا ایک انسانی ہمدردی کا تقاضا تھا، اور اس دھوکے سے مالک کا کوئی حرج بھی نہ تھا۔ جب یہ تمام باتیں اس کے دماغ میں گھومنے لگیں، تو اُس نے ہتھیہ کر لیا کہ اس جھوٹ کو مالک پر ظاہر نہیں ہونے دیا جائیگا اور مقصد بھر چھپا یا جائے گا۔ ورنہ اس پر یا اس کی حمامہ پر آنچ آنے کا اندیشہ ہے۔ یہ سوچ کر وہ کہتا ہے۔

ریاح: (کھسیانی ہنسی میں) اب آپ اور کیا پوچھنا چاہتے ہیں کیا بتاؤں؟ اس کی محبت نے میرے دل کو فتح کر لیا، وہ نہ صرف میرے گھر کی بلکہ میرے دل کی بھی مالک ہے۔

خلفت: "اچھا آپ کی وہ محبوبہ ہے، آپ کی آرام جان ہے اور آپ کی چہیتی ہے۔ کہہ تو یہ رہے تھے کہ اسے ذلیل کرونگا مگر اسے آنکھوں میں جگہ دے کر رکھا گیا ہے۔ ہو نہ، یہی بات ہے نا؟"

ریاح: "ذرا غور کیجئے، حمامہ ایک شہزادی تھی، بد قسمتی سے تمہارے پتے پر گئی، پھر لوٹدی بنالی گئی، پھر ایک غلام سے

بیاہ دی گئی، جسے اُس کی خدمت کا لالچ نہ تھا، پہلے تو اُس نے اس ذلت کو مجبوراً برداشت کیا، پھر وہ اس رشتے سے خوش بھی ہوئی اور پھر اس رشتے کو اپنی خوش نصیبی سمجھنے لگی۔ آپ ہی انصاف سے فرمائیے، ایسی مصیبت زدہ اور شریف الطبع دوشیزہ پر اور کیا مظالم بڑھاؤں:-

کہنے دیتی نہیں کچھ منہ سے محبت تیری

لب پہ رہ جاتی ہے آ آ کے شکایت تیری

اب ترا اے دل بیتاب خدا حافظ ہے

کر چلے ہم تو محبت میں حفاظت تیری

خلف: (ماپوس ہو کر) اچھا یہ بات ہے، غلامی نے تم دونوں کے

درمیان فرق مراتب کو ختم کر دیا۔"

ریاح: (سنسن کر) کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں کہ غلامی فرق مراتب

دور کر کے سب انسانوں کو ایک صف میں لاکھڑا کر دیتی ہے، اور

آزادی انسانوں میں فرق مراتب کی گہری گہری خلیجیں حائل

کر دیتی ہے، کوئی امیر کہلاتا ہے کوئی فقیر کوئی قادر ہے تو کوئی

عاجز، کوئی طاقتور ہے تو کوئی کمزور اور کوئی آقا ہے تو کوئی غلام

خدا جانے یہ اندھیری رات کب جائے گی اور وہ دل لہانے والی

سُہانی صبح کب آئے گی؟

خلفت: (تعجب سے) رباح! تمہارا دماغ تو نہیں پھر گیا، یہ کیا کہہ رہے ہو، کونسی رات اور کونسی صبح؟

رباح: "اندھیری رات ہمارا زمانہ ہے، جہاں غلامی مساوات قائم کرتی ہے اور آزادی تفریق پیدا کرتی ہے، اور سُہانی صبح وہ منتظر

عہدِ مبارک ہے جو تمام انسانوں میں خواہ وہ غلام ہوں یا آزاد عہد میں ہوں یا مرد و مسادات پیدا کر دے گی، اور بخیر نیک عمل کے

تفریق پیدا کرنے والے تمام اسباب مٹا میٹ کر دیئے جائیں گے سب ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے۔ سب کے یکساں حقوق ہوں گے

بس ان میں اعمال ہی سے امتیاز ہوگا، دولت و ثروت سے نہیں۔"

خلفت: (ٹھٹھا مار کر) رباح! آج تو تم کا ہنوں کی سی باتیں کر رہے ہو، یہ اندھیری رات اور سُہانی صبح کا ذکر اپنے پاس ہی رہنے دو، اپنے بیٹے کا حال بیان کرو، اس کا کیا نام ہے کیسی شکل و صورت ہے؟

رباح: (سنجیدگی سے) آپ میری اندھیری رات کا مذاق اُڑا رہے ہیں، وہ زمانہ بہت ہی قریب ہے جب یہ اندھیری رات ختم ہو کر

رہے گی، توقع ہے کہ اب سے تم بھی دیکھ لیں گے، اور وہ صبح اُمید ضرور طلوع ہو کے رہے گی۔ ممکن ہے ہم اپنی آنکھوں سے اس کا

اور دیکھا کہ مسرور ہوں، لیکن اگر بد قسمتی سے ہم اسے نہ دیکھ سکے
تو آپ کا بیٹا اُمیہ اور میرا بیٹا بلال تو ضرور ہی دیکھ لے گا۔
یہ سن کر خلف نے سر ہلایا اور شانے اٹھائے اور کہنے لگا:

خلف: ”ریاح! خاموش ہو جاؤ، مجھ سے یہ فضول باتیں نہ کرو، کسی
اور سے کرنا مجھے ان باتوں کے سننے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے

بیٹے بلال کی وجہ سے تمہاری تنخواہ بٹھائے دیتا ہوں، اگر میں
ایک بٹری قسم نہ کھا چکا ہوتا تو میں تمہاری بیوی کو اور تمہاری
طرح تمہارے بیٹے کو بھی آزاد کر دیتا۔ لیکن تمہیں تو معلوم ہی
ہے کہ یہ ہم سے لڑنے کے لئے، ہمیں ذلیل کرنے کے لئے، اور

ہماری حرمتوں کے پردے چاک کرنے کے لئے آئی تھی، لہذا اب
تم اپنی بیوی کے ساتھ خوش و خرم رہو سہو، جب تک میں
زندہ ہوں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔ میں تمہارے
ساتھ اس سے زیادہ کچھ اور نہیں کر سکتا۔“

ریاح: (طنز یہ لہجے میں) ”خوب، خوب! یہ تم سے جنگ کرنے آئی

تھی! اس بے چاری کو جنگ سے کیا تعلق، ایک سیدھی سادی اور
بھولی بھالی بچی جسے اپنا بھی ہوش نہیں وہ بھلا کیا جنگ کریگی؟

دنیا بٹری ظالم ہے، کیے کون اور بھرے کون!

خلف:۔ ایسا فلسفی میں نے کبھی نہیں دیکھا، اچھا جا کر اپنا کام دیکھو اور آنے والی زندگی کو قابل رشک و پر بہار بناؤ، خبردار اپنے فلسفے کی لوگوں کو خبر نہ کرنا، ورنہ تمہیں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔“

رباح اور حمامہ کافی عرصے تک خوش و خرم رہتے رہتے لے اور اپنی عمروں کی بہاریں دیکھتے رہے، دونوں تقدیر پر راضی اور تھوڑے پر قانع رہے۔ اب ان کی پوری ہمدردیوں کے حقدار ان کے دونوں بیٹے تھے۔ ایک تو بلال جو آگے چل کر اللہ کے رسول کا مؤذن بننے والا ہے، اور دوسرا بلال کا بھائی جس کا نام تو تاریخ نے بھلا دیا، البتہ اس کا کچھ دھندلا سا خاکہ ضرور کھینچا ہے۔ ان کے دونوں بچوں کی درمیانی تربیت ہو رہی تھی، جیسا کہ ان کے ہم جنس نیچے کے طبقے والے آزادی اور علامی کی درمیانی زندگی گزارتے ہوئے اپنے بچوں کو تربیت دیا کرتے تھے۔ پھر حمامہ اور رباح دونوں دار فانی سے چل بسے، اور دونوں بچوں کو خلف کی زمین میں کام کرتا چھوڑ گئے۔ یہ دونوں بچے بنی حجاج کی خدمت پر ما مور تھے۔ ان دونوں کے بعد خلف

نی دنوں تک زندہ رہا پھر وہ بھی چل بسا۔ وہ اپنے پیچھے
 ب کٹر بل نوجوان بیٹے (امیہ) کو چھوڑ گیا۔ امیہ اپنے بھائیوں کے
 ماتہ خلفت کا وارث بنا۔ رباح و حمامہ نے، اور نہ خلف نے تارک
 ت کی سہانی صبح دیکھی۔ البتہ بلال کو یہ سعادت نصیب ہوئی،
 وراس سہانی صبح کا نور ان کے دل میں سما گیا، امیہ کو بھی
 اس صبح سعادت کے درشن ہوئے، لیکن تیرہ چشم تھا، چندھیا
 لیا اور اس کے دل پر گھٹا ٹوپ تارکی چھا گئی۔ بلال کے
 نصیبے میں رسول اللہ صلعم کا تقرب آپ کی شفقت اور آپ
 کی خدمت کا شرف تھا، جس کو انھوں نے دونوں ہاتھوں
 سے خوب لوٹا اور اللہ کے محبوب اور خاص صحابہ میں شمار
 ہوئے اور امیہ کی قسمت میں دھتکے تھے۔ یہ اللہ کے رسول
 کا پکا دشمن ثابت ہوا آخر کار جنگ بدر میں مارا گیا۔ پھر
 نبی صلعم کی عداوت امیہ سے اس کے بھائی ابی کو ورنے
 میں ملی، جس نے جنگ احد کے موقع پر آپ کو قتل کرنا چاہا
 تھا۔ لیکن آپ نے اس کے ناپاک جسم پر نیزے سے ایک
 معمولی سی خراش پیدا کر دی تھی جس سے اس کے لئے موت کا
 دروازہ کھل گیا اور ذلیل چیخ چیخ کر مر گیا۔

ایک روز اُمیہ ابو جہل کے مظالم دیکھتے آتا ہے جو آل
 یاسر پر توڑے جا رہے تھے، وہ دُور سے ابو جہل کے عذابوں
 کی نوعیت دیکھتا ہے اور بڑی توجہ کے ساتھ اُن کا معائنہ
 کرتا ہے۔ پھر قریب آکر خوب دیکھتا بھالتا ہے پھر سر ہلا کر
 ابو جہل سے کہتا ہے:

اُمیہ: ابوالحکم! کل صبح صبح آپ بھی بنی حجج کے محلے میں تشریف
 لانا اور ملاحظہ کرنا کہ ہم اپنے بے کسوں، مکروروں اور بے ہمتوں
 کو کیسی کیسی سزائیں دیتے ہیں، اور ان کے سرغنہ بلال کو کیسی
 سزا چکھاتے ہیں!

اس ننھی سی جان پر یہ ظلم و ستم!

مہ انمار، ایک ننھی سی جان پر مظالم دیکھ کر "تم اس بچہ پر انتہائی ظلم و ستم توڑ رہے ہو، تم نے تو ان روح فرسا مظالم کا ریکارڈ توڑ دیا ہے سنگدل، بے رحم، ناخدا ترس اور پتھر دل لوگ ہو، میں نے کبھی ایسے درندہ تما انسان نہیں دیکھے۔"

یہ کہہ کر ام انمار ان عامری گنواروں میں جا گھستی ہے۔ کسی کے سینے میں مگہ مار کر پیچھے ہٹا دیتی ہے، اور کسی کا کپڑا پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ وہ ان درندوں کو اس ننھی سی جان سے ہٹا دیتی ہے جو اس پر پل پڑے ہیں۔ تھپڑ چاٹے، ٹاٹیں، مگے اور طرح طرح سے مار پیٹ رہے ہیں، اور خوفناک جھڑکیاں بھی دے رہے ہیں۔ عامریوں کا یہ چھوٹا سا گروہ مگہ میں نجد سے آیا تھا اور اپنے ساتھ عراق کا غلہ تجارت

کی غرض سے اونٹوں پر لا دیا تھا۔ جب یہ لوگ اپنا تجارتی سامان فروخت کر چکے، اور مال لاتے والے اونٹوں کے بھی بنا چکے تو اس بچے کو بھی فروخت کرنا پڑا۔ ادھر ادھر تجارتی منڈیوں میں بھی لے گئے، مگر اسے کسی نے بھی نہیں پوچھا۔ دیکھ کر وہ دل ہی دل میں کڑھنے لگے اور بھارے معصوم بچے پر برس پڑے۔ مار پیٹ، دھول دھپا، گالی گلوچ، ڈانٹ ڈپٹ اور دل ہلا دینے والی جھڑکیوں سے اُسے نیم مردہ بنا دیا۔ جب اُنھوں نے اس بچے کو واپس لے جانے کا قصد کیا تاکہ راستے میں کسی آتے جاتے عربی قبیلے ہی سے سودا کر لیا جائے، شاخ خوش قسمتی سے کوئی خریدار پیدا ہو جائے، تو بچے نے جانے سے انکار کر دیا، کیونکہ وہ ان بھٹیروں کے ظلم و ستم دیکھ چکا تھا۔ یہ کم بخت اُسے آٹھ آٹھ آنسو رلا چکے تھے۔ جب بچہ کسی قیمت پر بھی جانے کے لئے تیار نہ ہوا تو یہ درندے اُس پر ٹوٹ پڑے، اور اُسے خوب ہی زور کوب کیا اور دل کی بھڑاس نکالی۔ ابھی مار پیٹ ہی رہے تھے، کہ ادھر سے امّ انمار گذرتی ہے، جب امّ انمار یہ جگر روز اول سینہ سوز انتہائی گھناؤنا سلوک دیکھتی ہے، تو اُسے اس ننھی سی جان پر برس آ جاتا ہے۔ اُس کا دل بسیج جاتا ہے ہم نگوں

میں آنسو ڈبڈبایا آتے ہیں، اور بے سوچے سمجھے ان گنواروں میں گھس کر کسی کو دھکا دے کر پیچھے ہٹاتی ہے اور کسی کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور یہ کہتی جاتی ہے کہ کم بختو، دکھیارو، ناس پیٹو! ہٹتے کیوں نہیں۔ تم انسان ہو یا جانور، تمہارے دل پتھر ہیں یا لوہا۔ ارے تمہیں اس غریب پر ترس نہیں آتا۔ اسے آٹھ آٹھ آنسو رلا رکھا ہے، اور اس غریب کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ آخر زبردستی ان سے بچے چھڑا لیتی ہے۔

ایک عامری بچے اس سے کیا واسطہ؟ آئی بڑی چھڑانے والی! اگر تو حرم میں نہ ہوتی تو تجھے مزا چکھا دیتے۔ "ریہ سن کرام عمار کو غصہ تو آیا مگر خاموش ہو گئی۔ اور بنا ڈٹی ہنسی سنسنے لگی۔

اُم انمارہ۔ میں حرم میں ہوں تم میرا کیا بگاڑ سکو گے، کم بختو! تمہیں اپنے ان چوڑے چکلے جسموں پر، اس ہاتھیوں کے سے ڈیل ڈول پر، ان لمبی لمبی کھڑی ڈاڑھیوں پر اور ان دراز زلفوں پر شرم نہیں آتی۔ تم اس کمزور اور نحیف ولا غریبے کو کیوں ستا رہے ہو، کیوں اس پر ظلم ڈھا رہے ہو، اور کیوں غریب کا دل دکھا رہے ہو؟

ایک عامری:۔ اگر اس کے کھلانے پلانے کا فکر اور اس کا اور

خرچہ جو ہم پر ہے، تجھ پر ہوتا تو یوں نہ کڑھتی جیسے اب کڑھ رہی
 ہے۔ اور یوں لوٹ لوٹ نہ ہوتی جیسے اب ہو رہی ہے۔ یہ قطنی
 ناکارہ ہے، کام کا نہ کاج کا ڈھائی سیراناچ کا، پھر طرہ یہ کہ
 کم بخت ہماری بات بھی تو نہیں مانتا، ہمارے ساتھ چلنے پر
 راضی نہیں ہوتا، جیسے مکہ اسی کا وطن ہے، اور یہیں بنا بڑھا
 ہے۔ حالانکہ یہاں کا کوئی باشندہ اسے نہیں چاہتا۔

امّ اتمار: ہونہ، کیا یہاں کا کوئی باشندہ اسے نہیں چاہتا،
 میں ہی چاہتی ہوں، مجھے یہ برا اچھا لگتا ہے!
 عامری: "تو اسے خرید لے اور لے جا، خدا کرے تجھے برکت
 نہ ہو، اس بد نصیب غلام میں!"

آخر کار امّ اتمار عامریوں سے سودا کرنے لگتی ہے، اور بڑی
 رو قدر کے بعد یہ غلام بہت سستے پیسوں میں اس کے ہاتھ
 لگ جاتا ہے۔ عامری پیسے وصول کر کے اس بوجھ سے بھی ملے
 ہو گئے اور چلتے بنے۔ امّ اتمار اس ڈیلے تیلے اور کمزور غلام کا ہاتھ
 پکڑے ہوئے اپنے گھر لے آئی جو بنی زہرہ کے محلہ میں تھا۔ اس
 بیچارے کا بھوک سے برا حال تھا۔ سفر کی تکان سے چور چور تھا
 اور عامریوں کے ظلم کا تختہ مشق بننے سے خوف زدہ اور سہا سہا

تھا۔ نبی زہرہ کا جو آدمی (مرد یا عورت) اُسے دیکھتا ہنس کر یہی
 کہتا "اری ام انمار! کس مرگھٹ سے یہ مردہ گھسیٹ لائی!"
 اہم انمار! تم کیوں دیے ہوئے تمہیں اس سے کیا، میرا خریدا ہوا
 غلام ہے، میں نے اس پر اپنے خون پسینے کی کمائی خرچ کی ہے
 میں اسے اپنے گھر رکھوں گی اس کا ڈر جاتا رہے گا، اسے
 کھلاؤں گی پلاؤں گی، یہ میرے بچے کا دوست ہوگا، اس کے
 ساتھ کھلے کودے گا اور میری خدمت بھی کرے گا۔"
 گھر لے جا کر ام انمار اس غلام کو خوب نہلاتی دھلاتی ہے،
 صاف ستھرے کپڑے پہناتی ہے، محبت سے کھلاتی پلاتی ہے،
 اور شوق سے پہناتی اڑھاتی ہے۔ اس سلوک سے بچہ کا چہرہ خوشی
 کے مارے چمک اٹھتا ہے، اس کا کھلایا ہوا چہرہ کھل جاتا ہے،
 چونکہ یہاں اسے امن و چین میسر آیا تھا، آخر وہ روز بروز موٹا تازہ
 اور تندرست و توانا ہوتا چلا گیا۔ پھر ام انمار نے اپنے بیٹے
 عبدالعزیٰ کو بلا کر کہا، بیٹا یہ تمہارا بھائی ہے۔ ام انمار روزانہ بچوں
 کو گھر میں کھیلتا چھوڑ کر اپنے کام کے لئے نکل جاتی ہے، اور اپنے
 اوزار لئے مکہ کے گھر گھر کا چکر لگاتی ہے۔ ختنہ کرنے کے یہی
 اوزار اس کی کمائی کا ذریعہ تھے۔ جس سے وہ اپنا اور اپنے بیٹوں

کا پیٹ پالتی تھی۔ ام انمار عورتوں کے ختنے کیا کرتی تھی۔ آج
 راستے میں جاتے جاتے جی ہی جی میں کہہ رہی ہے۔ "ام انمار خدا
 تیری مدد فرمائے، تیرے ذمے اپنا اور اپنے ایک بیٹے کا خرچ تھا
 اب ایک بیٹے کا خرچہ اور پڑے گا۔" پھر خود ہی جواب دیتی ہے
 "دیکھ ام انمار! گھبرانے کی کوئی بات نہیں، جب ذرا بھی یہ بچہ
 ہو شیار ہو گا تجھے فائدہ پہونچے گا۔ خیر سے اتنا کما کر لائے گا کہ
 اپنے خرچہ کا بھی کفیل ہو گا اور اڑنے وقت تیرے بھی کام آئیگا
 ام انمار ایک خزاعی عورت تھی، اس نے مکہ میں سکونت
 اختیار کر لی تھی، اور بنی زہرہ کے ایک حلیف سے شادی کر لی
 تھی۔ یہ خاتون قریشیوں کے گھروں میں جا کر عورتوں کے ختنے
 کر کے اپنا گزارہ کر لیا کرتی تھی، جوانی جا رہی تھی بڑھا یا آ رہا تھا۔
 یہ بڑی خاموش عورت تھی، لیکن جب باتیں کرنے پر آتی تو سلسلہ
 کلام ختم ہی نہ ہونے پر آتا۔ اس دن شام کو جب اپنے گھر پہونچی
 ہے تو اپنے بیٹے اور غلام کو کھیل کود میں مصروف پاتی ہے۔ دونوں
 کھیلے کھیلے تھک جاتے ہیں۔ ام انمار انھیں محبت و پیار سے
 کھلاتی پلاتی ہے، پھر منس کر پیار سے غلام سے باتیں کرتی ہے
 ام انمار: بیٹا! تمہارا کیا نام ہے؟

غلام: "جناب"

ام انمار: "جناب تم کس کے بیٹے ہو؟"

جناب بن الارت: "بچہ را کا تلفظ صحیح ادا نہ کر سکا، جیسا کہ بچوں کی عادت ہوتی ہے۔ گویا اُس نے جناب بن الارت یا جناب بن الارت کہا۔"

ام انمار: "جناب بن الارت؟ بیٹا تم کس قبیلے کے ہو؟"

غلام: "قبیلہ و بیلہ مجھے معلوم نہیں۔"

ام انمار: "کیا تم عجمی ہو؟"

غلام: "عجمی و عجمی مجھے معلوم نہیں۔"

ام انمار: "بیٹا تمہاری ماں کا کیا نام ہے؟"

یہ سنتے ہی بچہ زار زار رونے لگا، روتے روتے پتلیاں

بندھ گئیں، اُس کے پھوٹ پھوٹ کر رونے سے ام انمار کی آنکھیں

بھی ڈبڈبا آئیں، اُس کا دل بسیج گیا، اُس نے بچے کو پہلانا پھلانا

شروع کر دیا، زوال سے اُس کے آنسو پوچھے، اُسے چمکارا۔ آخر بچہ

کی ڈھارس بندھی اور وہ خاموش ہو گیا۔ ام انمار نے اسے بچھونے

پر لٹا دیا اُسے ٹھپکتی رہی اور اُسے لوریاں دے دے کر سلانے لگی،

پھر جب تک وہ سونہ گیا اُس کے پاس نہ ہٹی اور حالات کی تحقیق

کل یا پرسوں تک ملتوی کر دی۔ آخر کل یا پرسوں بھی آگئی۔ اور ام امار
 نے بڑے پیار سے پہلا پھسلا کر کئی دنوں میں اس کے حالات
 معلوم کیے۔ بچہ اپنی ٹوٹی بھوٹی زبان میں کہتا ہے کہ عامریوں نے
 ان کے خاندان پر اچانک حملہ کر دیا، مرد باہر گئے ہوئے تھے صرف
 عورتیں ہی عورتیں تھیں یا اس کا باپ تھا۔ اس کے باپ نے
 جہاں تک ہوسکا ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ لیکن ظالم عامریوں نے
 اسے اس کے بیوی بچوں کے سامنے قتل کر دیا، پھر اس کا مال
 لوٹ لیا اور بیوی بچوں کو غلام و لونڈی بنا لیا۔ پھر ان کبختوں
 نے اس کی ماں کو تو کسی عربی قبیلے میں لے جا کر بیچ دیا اور
 بہن اسماء کو دوسرے قبیلے میں فروخت کر دیا۔ اور مجھ کو اور میرے
 باپ کے مال کو مکہ لے آئے۔ مکہ میں سامان تو آسانی سے فروخت
 ہو گیا مگر میں انھیں کے قبضہ میں رہا اور جو دوستم کا تختہ امشق
 بنا رہا۔ آخر تم نے مجھے عامریوں سے خرید لیا۔ یہ جانگداز واقعہ
 سن کر ام امار رو پڑتی ہے اور آج سے اس بچہ کے ساتھ غلامانہ
 برتاؤ نہیں کرتی، بلکہ سگی ماں جیسا سلوک کرتی ہے۔ مہینے اور
 سال گزرتے گئے اور بچہ ہوشیار اور سمجھدار ہوتا گیا۔ اس طویل
 عرصے میں جناب خود بھی یہ بات بھول گیا کہ میں ام امار کا غلام ہوں

بلکہ اپنے آپ کو ام انمار کا بیٹا اور عبد الغریٰ کو اپنا بھائی سمجھنے لگا
 اب خیر سے وہ جوان ہے اور یہی سمجھتا ہے کہ وہ تمہی اور نہ ہریوں
 کا حلیف ہے۔ جب خیاب کام کاج کے قابل ہو گیا تو ام انمار
 نے اسے ایک لوہار کے پاس کام سیکھنے کی عرض سے بٹھا دیا،
 یہاں وہ لوہے کے کام میں بڑا ہوشیار ہو گیا، اور طرح طرح کے ہتھیار
 بنانے لگا۔ ابھی اس کی بیس برس ہی کی عمر ہو گی کہ وہ اپنے او
 اپنی ماں کے لئے تھوڑا بہت کمانے لگا۔ رفتہ رفتہ اُس نے
 ایک دکان لے لی، جہاں لوہے کے ہر قسم کے ہتھیار بنانے جانے
 لگے۔ خیاب نے اپنے جیسے ہم طبقہ غلاموں کی طرح پردیش پائی
 جو مکہ کے بازاروں میں لاکر بک گئے تھے۔ مقدر نے ان کے باپوں
 کو یہاں لا پھینکا تھا۔ خیاب اگرچہ ایک غلام کی طرح پلا بڑھا مگر
 غلامی کا بوجھ اُسے محسوس نہ ہو سکا۔ ساتھ ہی ساتھ آزادی
 کی مٹھاس سے بھی نا آشنا رہا بلکہ ان دونوں حالتوں کے بین
 بین رہا، نہ پورا آزاد ہی ہوا اور نہ پورا غلام۔ وہ اپنے آس پاس
 ایک طرف تو بوڑھے سرداروں اور نوجوان آسودہ حال طبقے
 کو دیکھتا تھا، اور دوسری طرف بوڑھے گریے پڑے طبقے کو اور
 نوجوان غلاموں کو دیکھتا تھا جو غلامی پر قانع اور مقدر کے آگے

سر جھکائے ہوئے ہیں۔ دل تو اُن کے بھی آزادی کو چاہتے ہیں
 مگر اُن کی طاقتیں ہمتیں اور وسائل اُس حد تک پہنچنے سے
 قاصر ہیں۔ یہ طبقہ بظاہر تو اپنے آقاؤں اور سرداروں کا ادب و
 احترام کرتا ہے، مگر دل ہی دل میں اُنہیں کو ستا اور بددعا میں
 دیتا ہے۔ آزادی کے خواہشمند نوجوانوں کے دلوں میں سرداروں
 اور آقاؤں کے خلاف ایک ایسا جذبہ کار فرما ہے، جس کی
 آگ کی لپٹیں دور دور تک پہنچ رہی ہیں، اور چنگاریاں بجھنے
 میں نہیں آتیں۔ اُن کے دلوں میں انتہائی غیظ و غضب بھڑک رہا
 تھا۔ جس کی حدت زور ہی پکڑتی جاتی تھی۔ ان نوجوانوں کا خیال
 تھا کہ وہ اُن آسودہ حال نوجوانوں سے بیدار مغزی میں دور
 اندیشی میں ذکاوت و ذہانت میں اور کسی بھی صورت میں کم نہیں
 ہیں۔ کمی ہے تو یہ ہے کہ ان کے پاس مال، طاقت، آزادی
 اور خود مختاری نہیں ہے۔ زندگی نے انہیں کچھ ایسے نامناسب
 حالات میں مبتلا کر رکھا ہے کہ نہ وہ ان حالات کو برا کہہ سکتے
 ہیں اور نہ یہ حالات انہیں برا بھلا کہہ سکتے ہیں۔ ان کے لئے
 ترقی کی تمام راہیں مسرود ہیں۔ مقدر کا یہی فیصلہ ہے کہ وہ غلام
 بن کر رہیں، غلامی ہی میں زندگی گزرے اور غلامی ہی پر دنیا

سے سدھار جائیں۔ ان کے لئے زندگی میں فراخی، آسائش، عیش و آرام عزت و آبرو اور حقوق انسانیت مفقود ہیں۔ گویا وہ بندھے ہوئے گھوڑے ہیں جو لگاموں کے لوہے کو چبا رہے ہیں اور اپنی تیزی، برق رفتاری، اور غضب کی چال سے کھالوں سے باہر نکلے پڑتے ہیں۔ یہ کمزور اور بے لیس نوجوان جب کبھی اکٹھے ہوتے ہیں تو ان کا موضوع بحث یہی ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنی موجودہ افسوسناک حالات کے بارے میں طرح طرح کی خیال آرائیاں کرتے ہیں اور ان کی مجلس اسی دہی ہوئی حسرت اور پٹے ہوئے غصے پر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ جب گردہ نواح کی بستیوں پر نگاہیں دوڑاتے یا دیہاتی قبائل اور خانہ بدوش بدوؤں پر نظر ڈالتے تو انھیں ان کی تمام امیدیں پائمال نظر آتیں اور یاس و حسرت انھیں گھیرے ہوئے ہوتی

بلاشبہ اس طبقے کے لئے مکہ کی زندگی طرح طرح کے عیش و آرام سے بھرپور ہے، یہاں امن و امان بھی ہے، محنت و مزدوری بھی آسانی سے مل جاتی ہے، مال و جان اور آبرو بھی محفوظ ہے یہاں سالانہ ایک ایسا موسم بھی آتا ہے جب چاروں طرف سے لوگ حج کرنے آتے ہیں، اور عرب کے گوشے گوشے سے

قبائل کچھے چلے آتے ہیں۔ علاوہ ازیں دیگر ممالک سے تجارتی
 سلسلہ بھی قائم ہے، اس لئے یہاں کی زندگی پُر امن و پُر بہار ہے
 اور یہاں بڑی پھل پھل، بڑی رونق اور بڑی آسائیاں ہیں۔ انسان
 کا دل بھی خوب لگتا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود ان کے لئے
 زندگی کی راہیں مسدود ہیں، ترقی کی راہیں بند ہیں۔ یہ ساری
 بہار ہوشیار و ہوتیار آزادی سے ہم کنار لوگوں کے لئے ہے جو
 دولت و ثروت کے مالک اور عزت و طاقت والے ہیں، غلاموں
 اور حلیفوں کے لئے کیا۔ البتہ مکہ جن کا وطن ہے ان کے لئے
 زندگی کی راہیں چاروں طرف کھلی ہوئی ہیں، وہ زندگی کی رنگینوں
 کا دروازہ کھول کر جدھر چاہیں نکل جائیں اور دامنِ مراد بھر کر
 پھر اپنے وطن آجائیں۔ بیرونی تجارت اور سیر و سیاحت سے
 یہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

ایک دن جناب اپنے ایک دوست سے ملتا ہے، ادھر ادھر
 کی باتیں کرنے کے بعد اُسے محسوس ہوتا ہے کہ حسرت و یاس
 سے اور غم و نا اُمیدی سے اُس کا دوست آزاد ہو چکا ہے، اُسے
 پُر بہار اُمیدوں کی جھلک نظر آ رہی ہے۔ جناب اپنے دوست کی
 اس بدلی ہوئی حالت کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے:

دیکھ لیتا ہے تو سرکش ہو جاتا ہے، یقین مانئے آپ کو اپنے رب
کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

جناب یہ کلام سن کر تھرا اٹھتا ہے، خوف سے اس کے منت
بچنے لگتے ہیں۔ جسم کا رونگٹا رونگٹا کھڑا ہو جاتا ہے، پاؤں
ڈمگانے لگتے ہیں، اور کچھ دیر کے لئے اپنے دوست سے بھی
لے خیر ہو جاتا ہے، رفتہ رفتہ اس کے ہوش و حواس ٹھکانے آتے
ہیں، کیکیاہٹ دور ہوتی ہے اور وہ جم کر کھڑا ہو جاتا ہے، پھر
اپنے دوست سے دوبارہ ان آیتوں کے پڑھنے کی درخواست کرتا
ہے اور کہتا ہے "پیارے دوست ذرا ان کو پھر سنانا، میں ان کی
تاب نہ لاسکا اور ہوش و حواس کھو بیٹھا، افسوس کچھ بھی تو
نہ سمجھ سکا۔" اس کے دوست کو جناب پر ترس آ جاتا ہے، اور وہ
بار بار یہ مبارک آیتیں انہیں پڑھ کر سنانا ہے۔

جناب، (بڑے تعجب سے) ہونہ! کَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ
أَن تَرَاهُ اسْتَغْنَىٰ إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرَّجْعِي ۝ کیسا پیارا کلام
ہے، کس قدر پیارے انداز میں دولت کے نشے میں مغرور لوگوں کا
خاکہ کھینچا ہے۔ خدا را بناؤ یہ کس کا کلام ہے، اس کا پیارا انداز تو
صاف بتا رہا ہے کہ تمہارا کلام نہیں، تم نے کہاں سے سنا بتاؤ تو یہی

کس کے مبارک ہونٹوں سے نکلا، کیا میں بھی ایسا کلام سن سکتا ہوں؟

دوست: ہاں ہاں، کیوں نہیں، آؤ میرے ساتھ آئین کے پاس جاؤ، وہی ہمیں یہ کلام سناتے ہیں جو ان پر آسمان سے برتا ہے۔

ایک روز صبح کے وقت ابو جہل مسجد میں قوم کی بیٹھک میں بیٹھا ہے، خوب زور سے ٹھٹھا مار کر ہنستا ہے اور ران پر ہاتھ مار مار کر کہتا ہے

ابو جہل: (دانت پیس کر اور ران بجا کر) قریشیو! اگر تم جاہو تو کل ہمارے پاس آ کر ایک دلچسپ تماشہ دیکھ لینا، تمہیں معلوم ہے کہ نختہ کرنے والی کا بیٹا بے دین ہو گیا ہے۔ کل ہم دوپہر کے وقت اسے آگ میں جلا دیں گے!

ایک اُمت کا پھروا ہا

مسعود بن خافل ہنری حاجیوں کے ساتھ آیا اور مکہ میں اپنی
سسرال میں عبد بن حارث کے ہاں ٹھہرا، مسعود اپنے خسر
اور سالوں کے ہاں مقیم رہا جب تک حج کا موسم نہ گزر گیا پھر
جب اپنے وطن اور اپنے علاقہ کا رخ کرنے کا ارادہ کیا تو اپنے
میزبان سے کہنے لگا۔

مسعود: "ایک زمانے سے ہمارے علاقے میں نہیں آئے وہاں
تمہاری ایک صاحبزادی بھی تو ہیں جن کا تم پر تھوڑا بہت حق
سے اور ہاں تمہاری ایک نواسی بھی تو ہیں جس کا حق ماں
سے کچھ کم نہیں، کبھی بھولے بسرے ادھر بھی آ نکلا کرو۔ دیکھو ہماری
ملاقات کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔"

عبد بن حارث: "آپ کا فرمانا بجا ہے، بے شک مجھے وہاں گئے
ہوئے ایک عرصہ ہو گیا۔ بلاشبہ مجھ پر میری بیٹیوں کا بہت حق ہے

لیکن آپ کو معلوم ہے کہ فتنہ و فساد اور خوں ریزی نے ہمارے
 اور قیس کے دوستانہ تعلقات ختم کر دیے ہیں، گو آج کل لڑائی
 ختم ہو چکی ہے اور ہمارے تعلقات آہستہ آہستہ درست ہوئے
 جارہے ہیں اور حالات دن بدن سنورتے چلے جا رہے ہیں، لیکن
 پھر بھی قریشی نجد کے علاقے میں بڑے محتاط ہو کر نہایت ہوشیار
 رہنے چاہئے۔

مسعودیؒ: "ہیں! یہ تم کیا کہہ رہے ہو، حرم کے پاسیان قریشیو! تم تو
 امن و امان کے بادشاہ ہو، خوف زدہ تمہارے پاس آکر بے خوف و
 مطمئن ہو جاتا ہے، بھولے بھٹکوں کی تم خبر گیری کرتے ہو، مظلوم و
 دکھی تمہارے پاس دارو کے شفا پالیتا ہے، تمہارے لئے تو ساری
 روکے زمین حرم کی طرح ہونی چاہیے تاکہ خوف و مصیبت کے وقت
 تم بے خوف ہو کر چلو پھرو اور لیٹروں کی جماعت تم پر حملہ کرنے کی
 جرأت نہ کرے۔"

عیندہؓ: بات تو یہی مناسب تھی، جیسا کہ تم نے اپنا پاکیزہ خیال
 ظاہر فرمایا، لیکن افسوس قیسی ہمارے علاقہ میں گھس کر ہمیں جنگ
 پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہ گستاخ خاد خدا اور حرم کی حرمتوں کے پردے
 چاک کر دیتے ہیں اس کی عزت و عظمت کا کوئی خیال نہیں کرتے اس لئے

قیسیوں سے اور قیسیوں کے حلیفوں سے کوئی قریشی بھی لے نہ سکتا۔

مسعود (عبد کی باتیں غور سے سنتا ہے اور معاملہ کی تہہ تک پہنچ کر عرض کرتا ہے) "واہ عبد بن حارث، خوب اکیسی باتیں کر رہے ہو تمہارا تو ہنزل سے سسرالی رشتہ ہے اور پھر تمہاری صاحبزادی اور صاحبزادی کی صاحبزادی ہمارے ہاں موجود ہیں۔"

عبد: تمہیں خونی رشتوں کا خیال ہے، شکریہ اور بار بار شکریہ، ہنزل کے علاقے میں نہ تو مجھے کوئی خوف ہے اور نہ میرے سوا کسی اور کو دراصل تم لوگوں کے علاقے تک پہنچنے کے لئے قیسیوں کے علاقے سے گزرنا پڑتا ہے یا ان کے حلیفوں کے علاقے سے۔ مسعود: "واہ بھئی، تمہیں کیا فکر ہے۔ ایسا ہی ہے تو مجھ سے معاہدہ کر لو، جہاں تک ہنزل کی دسترس ہوگی تم حملہ آوروں سے محفوظ رہو گے اور جن علاقوں پر قریش کے اثرات ہیں وہاں میں حملہ آوروں سے بچا رہوں گا۔"

عبد: مجھے منظور ہے، اب مسعود اپنے وطن تنہا نہیں واپس ہوتا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کا حلیف اور خسر ہی عبد بن حارث بھی ہے عبد اس علاقے میں پہنچ کر اپنی صاحبزادی

ہند سے ملتا ہے جس کا شوہر ابن عبدود دینا سے رخصت ہو چکا ہے۔ اب یہ بیچاری بیوہ ہے، اور ام عبد سے بھی ملتا ہے جو اس کی لواسی ہے، اور اس کے ایک ننھے منے سے بچے کو لے کر پیار کرتا ہے جس کا نام عبداللہ بن مسعود ہے۔ عبد اس علاقے میں کچھ دنوں ٹھہرتا ہے اور پھر مکہ واپس آ جاتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد مکہ میں اس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اب یہ بچہ جو دہیال اور نہیال کی طرف سے ہزلی اور قریشی ہے اپنی دہیال میں اور دیہاتی بچوں کی طرح پلٹا بڑھتا رہا۔ ان لوگوں کی زندگی کے ایام بڑی تنگی ترشی سے بسر ہو رہے تھے بڑی کٹھن اور سخت زندگی تھی، فراخی کے بجائے تنگدستی اور آسائش کے بجائے تنگی ترشی تھی۔ ابھی یہ بچہ جوان بھی نہ ہونے پایا تھا کہ باپ سے بچھڑ جاتا ہے۔ اب اسے سرزمین نجد میں رہنا پڑا دشوار نظر آ رہا ہے یہاں محنت مزدوری آسانی سے نہیں ملتی، اور اس علاقہ کی زندگی انتہائی کٹھن ہے۔ روزگار نہ پا کر یہ نوجوان مکہ کا رخ کرتا ہے اور اپنی نہیال بنی زہرہ میں آ کر ٹھہر جاتا ہے۔ یہاں ایک عرصہ تک باہمی عہد و پیمان کی وجہ سے عزت کے ساتھ ٹھہرا رہتا ہے۔ مکہ کے نوجوان اسی وقت عیش و آرام کی

اور بے فکری کی زندگی گزار سکتے تھے جب وہ مالداروں اور
 رئیسوں کے چشم و چراغ ہوں۔ اوسط درجے کے قریشی نوجوانوں
 اور حلیفوں کو بھلا بے فکری اور عیش و آرام کی زندگی کہاں
 نصیب، انہیں تو ہوش سنبھالتے ہی پیٹ کی فکر لگ جاتی
 ہے، اور بے چارے روزگار کی تلاش میں مصروف ہو جاتے ہیں
 یہ طبقہ ہوشیار ہوتے ہی کمائی پر پل جاتا تھا، کسب معاش
 میں انہیں ذرا عار نہ آتی تھی اور نہ کمانے میں کوئی عیب یا
 بیکاری سمجھتے تھے۔ البتہ یہ بات ظہری غیر مناسب اور انتہائی بُری
 سمجھی جاتی تھی کہ انسان دوسروں پر بوجھ بن جائے اور بے
 غیرتی کی زندگی ڈھیت و بے حیا بن کر گزار دے۔ چنانچہ ابن مسعود
 بھی روزی کی تلاش میں دوڑے دوڑے پھر رہے ہیں۔ لوگوں
 کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ملتے جلتے
 والوں سے تبادلہ خیالات کرتے رہتے ہیں، مختلف قسم کی
 صنعتوں میں غور کرتے ہیں کہ کونسا کام اچھا ہے، بڑے غور
 و فکر اور کافی سوچ و بچار کے بعد انہیں ایک کام پسند آ جاتا
 ہے جو ان کی خاموش طبیعت اور مطمئن قلب کے عین مناسب
 ہے۔ عقبہ بن ابی معیط کی بکریاں چراگے پر مقرر ہو جاتے ہیں

اور مکہ سے باہر دور کھلے میدانوں اور وادیوں میں عقیدہ کی
بکریاں پھرانے پر مقرر ہو جاتے ہیں۔ بکریاں باڑے سے صبح
صبح لے جاتے، دن بھر کھلے میدانوں میں خوش و خرم سارا
دن گزار دیتے اور شام کو بکریاں باڑے میں واپس لے آتے
انہوں نے ہنہائی اختیار کر لی تھی، تاکہ لوگوں کی شرارت سے
محفوظ رہیں، اور لوگ ان سے بچتے رہیں۔ ایک دن ابن مسعود
حسب دستور بکریاں چرا رہے ہیں۔ اچانک ان کے پاس دو
اجنبی آکر کھڑے ہو جاتے ہیں، ان کے چہروں سے خوف محسوس
ہو رہا ہے جو رفتہ رفتہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ پھر یہ دونوں
شخص کچھ دیر سستاتے ہیں، آرام کرتے ہیں اور اپنی تھکن
دور کرتے ہیں۔ کچھ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے ان لوگوں کا
تعاقب کیا جا رہا تھا، اور انہیں لوگوں سے محفوظ رہنے کے
لئے مجبوراً بھاگنا پڑا تھا۔ ہمارا چرواہا ان نوواردوں کو چپ چاپ
کھڑا ہوا دیکھتا رہتا ہے اور چپ سادھ لیتا ہے۔ بھلا اس
چرواہے کو نوواردوں سے کیا واسطہ۔ اس نے تو آبادی سے
دور جنگل میں زندگی گزار دینا اسی لئے منتخب کیا ہے کہ لوگوں
سے کوئی تعلق نہ رکھے، اور سب سے الگ تھلک رہ کر زندگی

کے ایام منسی خوشی گزار دے۔ ان لوگوں میں سے ایک شخص آگے بڑھ کر پوچھتا ہے۔ تمہارے پاس کوئی دودھ والی بکری بھی ہے، ہمیں پیاس محسوس ہو رہی ہے، کچھ دودھ دے سکتے ہو؟ چرواہا افسوس کرتا ہوا عرض کرتا ہے کہ دودھ والی بکریاں تو ضرور ہیں مگر افسوس وہ امانت ہیں اس کی نہیں ہیں اگر اس کی ہوتیں تو کبھی بھل نہیں کرتا، اور ضرور اتنا دودھ دے دیتا جس سے تم لوگوں کی پیاس بجھ جاتی۔ یہ سن کر دوسرا شخص اپنے رفیق کو معنی خیز نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جیسے چرواہے کی امانت و دیانت کو سراہتا ہو اور اس کی نیکی اور بھلائی کی تعریف کرتا ہو۔ پھر دوسرا شخص اپنی منگھٹیں اور پُر جلال نگاہ چرواہے پر ڈال کر کہتا ہے:

دوسرا شخص: تمہارے پاس کوئی نو عمر اور بن بیاہی بکری بھی ہے؟

چرواہا: ہاں ہاں ایسی تو کئی بکریاں ہیں۔ پھر وہ کچھ دور جا کر روڑ میں سے ایک بکری کو لاکر پیش کرتا ہے۔ منگھٹن نگاہ والا شخص اس بکری کی ٹانگ پکڑ کر اپنے مبارک ہاتھ سے اس کے تھن چھوتا ہے، انھیں صاف کرتا ہے اور کچھ دعائیں پڑھتا جاتا،

چرواہا ان کلموں کو سنتا ہے مگر سمجھتا نہیں، دیکھتے ہی دیکھتے اس بکری کے تھن دودھ سے پھر پور ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ دودھ ٹپکنے بھی لگتا ہے جیسے کئی دن کا دودھ روک لیا گیا تھا۔ یہ دیکھتے ہی دوسرا رفیق اپنے رفیق سفر کے پاس دوڑ کر ایک پتھر کا پیالہ لاتا ہے۔ وہ اس میں دودھ دوہتا ہے اور جب وہ لبالب بھر جاتا ہے تو اپنے رفیق کو پینے کا اشارہ کرتا ہے۔ اس کا رفیق خوب سیر ہو کر پیتا ہے، پھر چرواہے کو پلایا جاتا ہے، وہ بھی خوب کوکھیں تان کر پیتا ہے، پھر خود پیتا ہے۔ پھر تھنوں سے کہتا ہے سگڑ جاؤ، تھن سگڑ کر اپنی اصلی حالت پر آ جاتے ہیں یہ عجیب و غریب ماجرا دیکھ کر چرواہا حیران و ششدر رہ جاتا ہے اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی، زبان بند ہو جاتی ہے، اور ہونٹ جیسے کسی نے سی دیئے ہوں۔ کچھ بھی نہ پوچھ سکا زبان کی گرہ کھلی ہی نہیں۔ وہ تو گم سم کھویا کھویا سا حیران و ششدر اور ہکا بکا کھڑا کا کھڑا رہ جاتا ہے۔ البتہ حیران نگاہوں سے بار بار ان نواردوں کو دیکھتا ہے۔ یہ اپنی حیرانی میں خود فراموش و دنگ رہا اور وہ دونوں عجیب و غریب انسان آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے چلے بھی گئے۔ کچھ دیر کے بعد

اُس کے ہوش و حواس بحال ہو جاتے ہیں، مگر اُسے یہ خبر نہیں کہ وہ کتنی دیر تک پیکر حیرت اور بے جان مجسمہ کی طرح بنسا رہا۔ اب اُسے یہ بھی ہوش نہیں کہ اُس نے باقی دن میں کیا کیا، اور کس فکر میں ڈوبا رہا۔ شام کے وقت جب آفتاب عالمتاب اپنے پھیکے رنگ والا دامن گھسیٹتا ہوا ٹیلوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں سے بھی عبور کر گیا۔ رات نے اس کا دامن اتار کر پھینک دیا، اور بچے بچے کالے بال بکیر دے کے تو اس وقت مجسمہ حیرت و استعجاب سے ذرا چوکتا ہوتا ہے اور کچھ ہوش میں آتا ہے، بکریاں اس کے آگے آگے ہیں اپنی لاشی سے ان پر تپتے جھاڑتا چلا جا رہا ہے۔ بکریوں کی اسے بالکل فکر نہیں کہ ریوڑ میں تمام بکریاں موجود ہیں یا کوئی پیچھے رہ گئی، اس وقت اس کے دل میں بس ایک ہی خیال کروٹیں لے رہا ہے۔ ایک نامعلوم سا خیال افسوس جسے وہ بیان بھی نہیں کر سکتا۔ اتنے میں بکریاں باڑے تک پہنچ جاتی ہیں۔ بکریوں کو باڑے میں داخل کر کے اور باڑے کا دروازہ بند کر کے چرواہا پورے سکون و اطمینان سے ڈگیں بھرتا ہوا کچھ پریشان و حیران سا وہ عقبہ کی تلاش میں اس کے گھر تک آ جاتا ہے۔ آخر عقبہ کو اپنے گھر کے صحن میں بیٹھا

ہوا دیکھتا ہے۔ چاروں طرف اس کے بیٹے پوتے اور دیگر اجائب
واقارب ہیں۔ نوجوان چودا جلدی سے اس کے پاس جانا ہی
اور کچھ دور کھڑے ہو کر عرض کرتا ہے۔

ابن مسعودؓ: اے الولید اب میں آپ کی بکریاں نہیں چرانے
کا کل سے کسی اور چرواہے کو مقرر فرمائیں۔

عقبہؓ: خیر تو ہے ہنری نوجوان! کیا بات ہو گئی، کیا تمہیں ہم سے
یا ہماری بکریوں سے کچھ تکلیف پہنچی یا کوئی ناگوار خاطر بات
پیش آئی؟

ابن مسعودؓ: جی نہیں، بات کچھ بھی نہیں مجھے کسی سے کوئی تکلیف
یا دکھ نہیں پہنچا لیکن اب میں نے بکریوں کا چرانا چھوڑ ہی
دیا ہے کوئی اور دھندا دیکھوں گا۔

یہ کہہ کر ہنری نوجوان جواب اور لوگوں کی قیاس آرائیوں کی
پر واہ کے بغیر اٹے پاؤں واپس آ جاتا ہے، اور پھر کبھی عقبہ کے
گھر نہیں جاتا۔ پھر ٹھیک اسی مقام پر پہنچتا ہے جہاں کل بکریاں
چرا رہا تھا، وہی دونوں نوجوانوں کی آنکھوں میں پھرتے لگتے
ہیں، ان کے چہروں سے خوف کے آثار نمایاں ہیں۔ آہستہ
آہستہ ان کا خوف دور ہو کر چہرے کھل جاتے ہیں وہ تھکے ہوئے ہیں

تھوڑی دیر آرام کرتے ہیں، پھر تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ اب وہ کہہ رہے ہیں کہ بھی چرواہے تھوڑا سا دودھ کیوں نہیں دیتے ہم اپنی پیاس بجھالیں، وہ یہ کہہ کر کہ بکریاں امانت ہیں، میں ان کا مالک نہیں ہوں صاف جواب دیدیتا ہے۔ پھر وہ چھ سات مہینے کی ایک پٹھیا لے آتا ہے۔ ایک مطمئن نگاہ والا شخص اس کے تھنوں کو چھو رہا ہے، ساتھ ساتھ کچھ دعائیں بھی پڑھ رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے تھن دودھ سے اس قدر لبریز ہو جاتے ہیں کہ دودھ زمین پر ٹپکنے بھی لگتا ہے۔ پھر تینوں سیر ہو کر دودھ پیتے ہیں، ایسا لذیذ دودھ تو کبھی پیا ہی نہ تھا۔ واہ واہ! کیا ذائقہ ہے۔ اب تک اس سے دہن و کام شیریں ہیں، اب تک اس کا ذائقہ موجود ہے، لبوں پر وہی حلاوت ہے اور زبان پر وہی چاشنی ہے۔ پھر وہ تھنوں سے کہتا ہے سکر جاؤ اور وہ بدستور سابق سکر جاتے ہیں۔ اس دعا کو بھی سوچتا ہے جو اس شخص نے اس وقت پڑھی تھی، جبکہ بکری کے تھنوں پر وہ اپنا مبارک ہاتھ پھیرتا جا رہا تھا۔ مگر افسوس اس کا ایک لفظ بھی یاد نہیں آتا، جب بار بار دماغ پر زور ڈالنے کے باوجود دعا کا ایک لفظ بھی یاد نہیں آتا۔

تو وہ ہر اسال ہو جاتا ہے اور طرح طرح کے شکوک میں مبتلا
 ہو جاتا ہے۔ اُسے اب سے پہلے اس قدر کسی چیز کی خواہش
 نہیں ہوئی تھی جس قدر آج اس دعا کے یاد آجانے کی سے
 جالانکہ پہلے ذہن کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ بات سن کر دل پر نقش
 ہو جاتی تھی لیکن یہ کلام کچھ اور ہی تھا جو دماغ سے نکل گیا ہرنلی
 نوجوان دل ہی دل میں کہہ رہا ہے۔ اس مطمئن نگاہ والے شخص
 اس کے رفیق سفر اور اس کے کلام میں کوئی نہ کوئی راز ہے
 جو مجھ پر کھل نہ سکا۔ ہرنلی نوجوان اس مقام پر کافی دیر تک کھڑا
 ہوا تمام گزشتہ مناظر سوچتا رہتا ہے۔ یکے بعد دیگرے ہر چیز
 ترقیب وار اس کے سامنے آتی ہے اور چلی جاتی ہے۔ وہ خاموش
 اور غیر متحرک کھڑا رہا، اس پاس نظریں دوڑاتا رہا۔ پھر آسمان
 کو دیر تک دیکھتا رہا۔ بظاہر اب وہ کسی بات میں غور نہیں کر رہا
 ہے یا اس پر خود فراموشی چھائی ہوئی ہے۔ البتہ پہلے پہل تو
 اس کے ذہن میں پھر اس کی آنکھوں کے سامنے وہی مطمئن
 نگاہ والا نوار اور اس کا رفیق سفر چل پھر رہا ہے وہ سارے
 مناظر ترتیب وار دکھائی دے رہے ہیں وہی دعا کانوں میں گونج
 رہی ہے۔ مگر اب غور کرنے پر بھی یاد نہیں آتی۔ شام کے وقت

ہنری لوجوان وہاں سے لوٹتا ہے مگر واپس نہیں آتا، بلکہ
مگہ کے آس پاس ادھر ادھر گھومتا پھر رہا ہے۔ دماغ میں
وہی مناظر ہیں، آنکھوں کے آگے وہی پراسرار شخصیت ہے اور
وہی دعا کالوں میں گونج رہی ہے جو آپ یاد کرنے پر بھی یاد
نہیں آتی۔ اسی وحشت میں وہ رات بھر گھومتا رہا، اُسے
سکان کا ذرہ برابر اثر نہیں ہوا۔ کیسی نیند اور کہاں کی بھوک
پیاس وہی ایک فکر و وحشت غالب ہے۔ البتہ وہ پراسرار
دوڑھ اور اُس کا ذائقہ اب تک زبان محسوس کر رہی ہے،
ہنری لوجوان ساری رات یوں ہی گزار دیتا ہے، نہ بستر
سے نہ تکیہ ہے، بس وہی ایک فکر و وحشت سوار ہے۔ صبح
کو جب سورج نکل چکا اور چرواہے بکریاں لے کر چل پڑے
تو وہ مگہ پہنچتا ہے۔ لیکن شہر میں بھی وہی مبارک صورتیں آنکھوں
کے سامنے ہیں۔ اُسے اُس وقت تک چین نہیں آتا جب
تک ان مبارک صورتوں کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ جو بندہ
یا بندہ، تلاش کرتے کرتے آستانہ رسول پر جا پہنچتا ہے
اور محمد رسول اللہ صلعم کو پا لیتا ہے۔ جب ان کی طرف
دوڑتا ہے تو آپ اُسے اسی مطلق نگاہ سے دیکھتے ہیں جو اُس

کی آنکھوں میں پھر رہی تھی، اور مسکرا دیتے ہیں۔ نوجوان آپ کے بالکل قریب پہنچ کر دو زاوہ مودب سامنے بیٹھ جاتا ہے۔ نوجوان: (لہزدنی ہوئی دھیمی آواز میں) مجھے وہ کلام سکھا دیجئے جیسے میں نے کل آپ سے سنا تھا۔

رسول اللہ صلعم: (مسکرا کر اور سر پر ہاتھ پھیر کر) "بے شک بے شک تم میں تعلیم کی صلاحیت ہے۔"

اس گٹھری سے نوجوان کے دل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ وہ نہ اپنے لئے پیدا ہوا نہ گھر والوں کے لئے اور نہ عقبہ کی بکریاں چرانے کے لئے، بلکہ اُس کی پیدائش کا صرف ایک ہی مقصد ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہ صلعم کی صحبت میں رہ کر آپ کی احادیث سن کر انہیں یاد کرنا اور تبلیغ کر کے آپ کی دعوت کو دور دور تک پھیلانا۔ یہ نوجوان ہلکا پھلکا، دبلا پتلا اہٹائی پھرتیلا اور کمال چست و چالاک ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک صحبت میں بیٹھے ہوئے ابھی چند ہی دن گزرے تھے کہ قریشی مکہ میں جگہ جگہ اس ہنری نوجوان کو رسول اللہ صلعم کا ذکر خیر کرتے ہوئے سنتے ہیں، اور آپ کی مبارک دعوت کی تبلیغ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ ہر مجلس میں اسلام کی خوبیاں

بیان کرتے ہیں، اور ہر محفل میں نئی تحریک کی برکتیں دکھاتے ہیں
 اور اپنی تیزی، پھرتی، چستی اور چالاکی اور سرگرمی عمل سے
 قریشیوں کے لئے ایک بغلی گھونسہ بنے ہوئے ہیں۔ قریشی
 کسی جگہ انھیں اسلام کی تبلیغ کرتا ہوا دیکھتے اور وہاں
 پہنچنے کا ارادہ کرتے، لیکن جب وہاں پہنچتے تو معلوم
 ہوتا کہ وہ تو یہاں سے چلا گیا۔ قریشی تعجب ہی کرتے رہ جاتے
 کہ کیسے چلا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے
 صحابہ کرام کا پیچھا کرنے والے اس نوجوان کو ہر جگہ دیکھتے مگر
 پکڑنے میں ناکام ہی رہتے۔ انھیں خیال ہوتا کہ نہ معلوم کیا بلا
 ہے، بھوت ہے یا چھلاوا ہے، ابھی یہاں سے اور ابھی وہاں
 ہے۔ آخر ایک دن ابو جہل تنگ ہو کر کہنے لگتا ہے :-
 ابو جہل، (دانت پس کر) میں محمد کے کسی ساتھی سے اتنا تنگ
 نہیں آیا جتنا اس کم بخت ہنری جوان نے پریشان کر رکھا ہے،
 اسے ہر جگہ محمد کی دعوت کی تبلیغ کرتا ہوا اور لوگوں کے خیالات
 بگاڑتا ہوا دیکھتا ہوں، لیکن اس اردے کو قابو میں لانے کی
 کوئی صورت نہیں پاتا۔ اگر میں کسی دن اس مہم میں کامیاب ہو گیا
 تو بڑی بے رحمی سے پیش آؤں گا۔

عقبہ: "ابوالحکم! ذرا علم و بردباری اور صبر و ضبط سے کام لو، اور سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھاؤ۔ اس ہنری نوجوان کے پیچھے مت پڑو۔ کیونکہ بنی نہرہ تمہاری اس حرکت سے مشتعل ہو جائیں گے اگر تم نے ذرا بھی اس نوجوان کو چھڑ دیا تو سب ہنری بھڑک اٹھیں اور ہمارا وہ تجارتی راستہ مسدود و خطرناک ہو جائے گا جس کی حفاظت قریش کو دل و جان سے پیاری ہے۔ خیر اسی میں ہے کہ ان سے صلح پسند رہو ورنہ نقص امن کا اندیشہ ہے۔"

ابو جہل: "چچا جان! آپ کا مشورہ دور اندیشی پر مبنی ہے، اور وقت کا عین تقاضا ہے۔ بہت بہتر۔ لیکن پھر بھی لات و عنزی کی قسم! اگر یہ سانپ میرے قبضے میں آگیا تو سر کھلے بغیر نہ رہوں گا۔ خدایے کو تاخیر نہ دے کہ اپنا ہی سر خونم خون کر لے۔ ابو جہل کے قبضے میں کسی موقع پر بھی وہ نوجوان نہیں آیا، البتہ جب نبی کریم صلعم نے صحابہ کو حبشہ کی ہجرت کی اجازت دے دی تو اس موقع پر ابو جہل نے اس نوجوان کے قریب پہنچ کر کچھ شرارت کرنی چاہی تھی۔ لیکن موقع پر ہی ذلیل و خوار ہو کر اپنا سامنے لیکر واپس ہو گیا تھا۔ بات یہ ہوئی کہ وہ اتفاق سے ایک دن مسجد سے گذر رہا تھا، اُس نے دور سے لوگوں کا ہجوم دیکھا جو ایک

Marfat.com

یہ دُور سے ایسا
 علم ہوتا تھا جیسے یہ کمزور و نحیف شخص حاضرین کو کچھ سمجھا رہا
 ہے، اور لوگ بڑے شوق و اہتمام کے ساتھ اُس کی تقریر سن
 رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر ابو جہل آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا، اور
 یواروں سے لگتا لگاتا ہوا آگے بڑھتا ہے تاکہ کوئی شخص اُسے
 کیلئے نہ پائے۔ آخر کار اس ہجوم کے پاس جا کر اور چھپ کر ایک
 لیے مقام پر کھڑا ہو جاتا ہے کہ وہ تو ہجوم کو صاف طرح دیکھ سکے
 لیکن ہجوم کی اُس پر نگاہ نہ پڑ سکے، اور کان لگا کر بڑی توجہ سے
 اُس دُبلے پتلے آفت کے پرکالے کی باتیں سنتا ہے۔ اُس کے
 کانوں میں ایک درد بھری آواز آرہی ہے جس میں ایک رس
 ہے۔ یہ بڑا موثر اور عظیم کلام ہے۔ اس وقت ہنری ٹوبوان حاضرین
 کو سورہ فرقان کی یہ مبارک آیتیں سن رہا ہے:-

وَعِبَادَ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلٰى الْاَرْضِ
 هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا
 وَالَّذِيْنَ يَلِيْمُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا
 وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ
 اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا اِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا

وَمَقَامًا وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ
 يُفْتَرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ
 مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي
 حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ وَمَنْ يَفْعَلْ
 ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا يُضْعَفُ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ
 الْقِيَامَةِ وَيَخْلُدُ فِيهِ مُهَانًا إِلَّا مَنْ تَابَ وَ
 أَمِنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ
 سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا
 وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ
 مَنَابًا وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ وَإِذَا
 مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا

(قرآن مجید سے ۲۷ تک)

اور رحمن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عبثی سے چلتے ہیں
 اور جب ان سے جاہل بات کرتے ہیں تو یہ رفع شرکی بات کو
 ہیں، اور جو راتوں کو اپنے رب کے آگے سجدے اور قیام میں
 لگے رہتے ہیں اور جو دعائیں مانگتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم سے
 جہنم کا عذاب ہٹا دے، کیونکہ اس کا عذاب چٹ جانے والا ہے

بلاشبہ جہنم برا ٹھکانا اور بُرا مقام ہے ، اور یہ لوگ جب خرچ کرنے پر آتے ہیں تو نہ تو فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ تنگی ہی کرتے ہیں بلکہ اعتدال سے خرچ کرتے ہیں ، اور جو اللہ (تعالیٰ) کے ساتھ کسی اور کی عبادت نہیں کرتے اور جس جان کو اللہ ﷻ نے اُن پر حرام فرمادیا ہے اُسے قتل نہیں کرتے ، البتہ حق پر قتل کرتے ہیں ، اور وہ زنا نہیں کرتے اور جو شخص ایسا کام کرے گا اُسے نرا سے ضرور سابقہ پڑے گا کہ قیامت کے روز اُس کا عذاب بڑھتا ہی جائے گا ، اور وہ جہنم میں ہمیشہ ذلیل ہی رہے گا ، مگر جو توبہ کر لے اور ایمان لے آئے اور نیک کام کرتا رہے تو اللہ ﷻ ایسے لوگوں کو گناہوں کی جگہ نیکیاں عطا فرمائے گا اور اللہ ﷻ غفور رحیم ہے ۔ اور جو شخص توبہ کر لے اور نیک عمل کر لے بلاشبہ وہ خدا کی طرف خاص طور سے رجوع کر رہا ہے ۔ اور وہ بے ہودہ باتوں میں شامل نہیں ہوتے اور اگر بے ہودہ مجلسوں سے گزریں تو سنجیدگی سے گزر جاتے ہیں ۔

یہ کلام سن کر ابوجہل کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے اور اُس کا ضمیر اُس پر ملامت کرتا ہے ۔ اگر وہ اپنا دل فطرت

کے ہم نوا بنا دیتا تو اس کی زبان سے بھی وہی الفاظ نکلتے جو دیگر
 حاضرین کی زبانوں سے نکل رہے ہیں۔ حاضرین بڑی بے صبری
 اور کمال اشتیاق سے جواب دے رہے ہیں۔ خدا کی قسم ہم
 بھی اسی قسم کے لوگوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ
 اپنی فطرت مسح کر کے غرور و تکبر سے کام لیتا ہے۔ پھر گرجتا ہوا
 اس ہجوم پر اس طرح ٹوٹتا ہے جیسے عقاب اپنے شکار پر۔
 ابو جہل، (گر حدار اور پُر رعب آواز میں) "تم پر دیوتاؤں کی
 پھٹکار ہو، بد نصیبو! تم نے یہ کیا اودھم مچا رکھا ہے۔ ہمت و حوصلہ
 تو دیکھو نہیں ایک سر پہرے شخص کے پاس جمع ہوتے ہوئے شرم
 نہیں آتی، جاؤ، ایک چلو پانی میں ڈوب مرو۔ کم بختو! قریشی
 مجلسیں بھی تو کچھ دور نہیں ہیں، مسجد میں ہمارے پاس کیوں نہیں
 آتے کہ تم ہمارے سامنے محمد کے پروپیگنڈے کی قلعی کھولیں۔
 اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے دکھائیں۔ اس
 بدخلق بدتمیز اور ڈراؤنی شکل کے شخص کو دیکھ کر ہجوم پر سناٹا
 چھا جاتا ہے، اور آن کی آن میں سب لو دو گیارہ ہو جاتے ہیں
 نہری نوجوان اپنی جگہ پر ڈٹا ہوا ہے۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت
 مرعوب نہیں کر سکتی۔ ابو جہل طیش کھا کر اس کی طرف پھپھکتا ہے۔

ابو جہل: (گرج کر) ”بد معاش غنڈے! تو ہمارے حلیفوں اور غلاموں کے خیالات بگاڑنے سے باز نہ آئے گا، جب تک میرے ہاتھ سے مار نہ کھائے گا۔“ ابھی نوجوان اس کم بخت کی بکو اس کا جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ خبیث نے کمان مار کر نوجوان کا سر پھوڑ دیا۔ نوجوان کے چہرے پر خون بہنے لگا۔ اب زخمی شیر بھیر کر اٹھتا ہے اور پھرتی سے ابو جہل کی طرف لپکتا ہے۔

ہنرلی نوجوان: ”اچھا... یہ زیادتی اور یہ فرعونیت، کم بخت جواب بھی لے، میں ہنرلی جوان ہوں ہنرلی۔“ یہ کہہ کر پہلے تو اس زور کا طمانچہ رسید کیا کہ پانچوں انگلیاں ابھرائیں اور پھر سینہ میں ایسا گھونسنہ مارا کہ ابو جہل قلا بازی کھا گیا۔ پھر ہنرلی نوجوان آہستہ آہستہ تہایت اطمینان سے اس کے پاس سے ہٹ گیا۔ اور ابو جہل کو بیچ و تاب کھاتا ہوا وہیں چھوڑ دیا، یہ سان و گمان بھی نہ تھا کہ کوئی قریشی حلیف اتنی بڑی جسارت سے کام لے گا، جب اس کا سانس درست ہوا، تو پھر سانپ کی طرح بل کھانا ہوا چنچا،

ابو جہل: ”ابے گڈریے! مجھ سے بچ کر کہاں جائیگا۔“

ہنرلی نوجوان: ”خدا کے دشمن ملعون تو بھی مجھ سے بچ کر نہیں جا سکتا۔“ پھر دونوں نے اپنی اپنی جماعت کا راستہ لیا۔ ہنرلی نوجوان

رسول اللہ صلعم کے پاس جا کر آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگا۔
 ”اے اللہ کے رسول! اب میں مکہ میں نہیں رہ سکتا۔ آج میں نے
 طمانچے اور گھونسے سے ابو جہل کی مرمت کر دی ہے۔ اب ہجرت
 کے سوا کوئی چارہ نہیں، خدا کی قسم میں ہجرت سے خوش بھی ہوں
 اور رنجور بھی، خوشی ثواب و مغفرت کی ہے اور رنج جہانی کا ہے
 جس کی بدت نامعلوم ہے چونکہ آج ابو جہل کی خودداری خاک
 میں مل گئی تھی، اور وہ دل ہی دل میں گھٹ رہا تھا، مگر پھر بھی
 جذبات انتقام کو چھپا کر پر غرور انداز میں اپنی قومی مجلس میں
 کہتا ہے۔

ابو جہل: ”مخزومیو! لٹیٹا ٹوب گئی تمہاری آبرو خاک میں مل رہی
 ہے، اور تمہیں ہوش نہیں، اگر تمہیں اپنی رہی ہی عزت کی
 لاج رکھنی ہے تو اس سے میرا انتقام لے لو، اور اس گستاخ کو
 میرے حوالے کرو۔ آج اُس نے اتنا عظیم جرم کیا ہے جس کی پاداش
 اس کا خون ہی ہو سکتا ہے۔“ قوم یہ سن کر آگ بگولہ ہو گئی، اور مکہ
 کی گلی گلی میں ابن مسعود کی تلاش ہونے لگی۔ لیکن بقول ان کے
 چھلاوا بھی کہیں ہاتھ آیا ہے۔ ابن مسعود بچ کر صاف
 نکل گئے، اور خیبریتا سے نجاشی کے ملک جا پہنچے۔

پھر جنگ بدر کے موقع پر ابو جہل اپنے سینے پر
 اپنے حریف ابن مسعود کو چڑھا دیکھتا ہے مگر کہہ کیا سکتا ہے
 ابن مسعود اس کا سر کاٹ کر اس کی سرکشی کو خاک میں ملا دیتے
 ہیں۔



”سالم کو میں خریدوں گی“

یہ تو میں کیونکر کہوں تیرے خریداروں میں ہوں

تو سراپا ناز ہے، میں ناز برداروں میں ہوں

حسبِ عادت سلام بن جبیر قرظی اس سال بھی مدینہ میں شام سے طرح طرح کا تجارتی سامان لایا جس میں رنگ برنگ کی چیزیں اور دیگر خوبصورت سامان تھا۔ بعض چیزیں شام میں تیار ہوتی تھیں، اور بعض جزیرہ میں علاوہ ازیں بعض ایسی چیزیں بھی تھیں جن کو رومی دمشق اور بصرہ کی منڈلیوں میں لاکر عربوں اور یہودیوں کے تاجروں کو ہتیا کرتے تھے۔ تاکہ یہ چیزیں ان تجارت کے ذریعہ ان دور دراز مقامات پر بھی پہنچ جائیں جہاں قیصر روم کی حکومت نہیں ہے، اور نجد، حجاز، ہمامہ اور یمن کے ان علاقوں میں بھی جہاں رومی دسترس نہیں۔ ابھی سلام بن جبیر نے بنی قریظہ میں ٹھہر کر باقاعدہ آرام بھی نہ لیا تھا اور

سفر کی تھکان دور بھی نہ کر سکا تھا کہ اُس نے اپنا رنگ پرنگ کا
تجارتی سامان لوگوں کو دکھانا شروع کر دیا۔ گرد و نواح کے تمام
یہودی سامان دیکھنے اور خریدنے کے لئے ٹوٹ پڑے، اور چند
ہی گھنٹوں میں سلام اپنا سارا مال فروخت کر کے ہاتھ جھاڑ کر
کھڑا ہو گیا۔ اس سامان سے سلام کو بیش بہا نفع ہوا۔ البتہ ایک
غلام اس کے لئے درد سہری کا باعث بنا رہا جو کسی طرح فروخت
ہی نہ ہوتا تھا۔ اس غلام کو نہ تو عربوں نے پوچھا اور نہ یہودیوں
نے، اگر یہ غلام فروخت ہو جاتا تو پھر سلام کے مزے ہی مزے
تھے۔ وہ اطمینان و تسلی سے آنے والے چند مہینے عربی اور یہودی
قبیلوں میں گھومتا پھرتا گزار دیتا۔ اور آنے والے موسم میں
شام کو لے جانے والا سامان اپنے غلاموں اور حلیفوں کو
یشریب کے آس پاس والے علاقوں میں عربوں اور یہودیوں
کے قبیلوں میں دور دور تک بھیج کر اکھٹا کر لیتا۔ لیکن یہ غلام
اس کے گلے میں پھندا اور اُس کی اُمیدوں کے درمیان حائل
تھا۔ سلام نے بصری کی منڈی میں اس کو کسی کلبی سے بڑا
سستا خرید لیا تھا۔ اس کا گمان تھا کہ اس غلام کو کسی یشری
کو دگنے دگنے داموں پر آنکھیں بند کر کے پھینک دیگا۔ اس طرح

اس میں فائدہ ہی فائدہ ہوگا۔ مگر شرب کے باشندوں نے سلام کو کبھی تجارتی غلام لاتے اور فروخت کرتے دیکھا ہی نہ تھا۔ جب انہوں نے سلام کی غلام کے فروخت کرنے کی بے حد رغبت دیکھی اور اس کا غیر معمولی اصرار دیکھا تو وہ غلام سے بدظن ہو گئے اور دل ہی دل میں کہنے لگے۔ اوہو سلام نے اس غلام کو اپنے لئے خریدا ہوگا، پھر شاید اس میں کوئی عیب یا بیماری پائی ہوگی جو اب اسے فروخت کرنا چاہتا ہے، حالانکہ غلام کو نیچے کی اسے چنداں ضرورت نہیں۔ غلام کے چہرے اور شرے سے بھی بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی اندرونی بیماری یا تکلیف میں مبتلا ہے، جیسے اس کے مالکوں نے اسے ستایا اور دکھ درد پہنچایا ہو۔ اسے عربی زبان پر بھی قدرت نہ تھی نہ اس زبان میں صحیح طور سے اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا تھا۔ البتہ ٹوٹی پھوٹی زبان میں اپنا کام نکال لیتا تھا اور رومی زبان سے تو بالکل ہی نا آشنا تھا، اس کا ایک لفظ بھی نہ بول سکتا تھا۔ جب کوئی شخص اس سے بات چیت کرتا تو اس کی زبان پر بے ساختہ فارسی زبان کے الفاظ آجاتے، جنہیں کوئی نہیں سمجھتا تھا۔ سلام نیچے کی غرض سے اس کی بڑی تعریف کرتا، اور نئے نئے انداز میں اس کی خوبیاں بیان کرتا۔

سلام: یہ بچہ فاقہ زدہ ہے، اسی لئے نحیف و لاغر ہے، جب اچھی
 خوراک ملنے لگے گی تو اس کی حالت روز بروز بہتر سے بہتر ہوتی چلی
 جائے گی۔ یہ ہونہار حسبت و چالاک ہاتھ کا کاریگر اور محنتی بچہ ہے
 اہتمامی شریف اور فارسی خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ اس خاندان نے
 صطخر سے آکر ابلہ میں ساکونت اختیار کر لی تھی۔ اس علاقے میں ان
 لوگوں کے زرعی اراضی کے رقبوں کے رقبے موجود ہیں جنہیں یہ
 لوگ نبطیوں کو بٹمانی پر اٹھاتے ہیں۔ علاوہ ان میں اس خاندان کا
 اطراف عراق میں دور دور تک تجارتی کاروبار بھی پھیلا ہوا ہے۔ اگر
 کوئی سلام سے اس کے خاندان کے بارے میں مزید معلومات
 حاصل کرنا چاہتا اور اس سے کچھ اور پوچھتا تو اس کا جواب نہ
 بن آتا تھا۔ البتہ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا کہ جس شخص نے مجھے یہ
 غلام بیچا ہے اس کا کہنا ہے کہ جب عربوں نے رومیوں کے ساتھ
 ابلہ پر حملہ کیا تھا تو اسے بھی عرب وہاں سے لوٹ کر لے آئے
 تھے۔ پھر کسی کلبی نے خرید لیا پھر اس کا مالک بصری کی منڈی میں
 اسے بیچنے کی غرض سے لایا تا کہ کسی عربی یا یہودی سوداگر کے ہاتھ
 فروخت کر دے۔ مجھے اس کی بھولی بھالی صورت دیکھتے
 ہی ترس آگیا۔ اور میں نے دیگر ضروری سامان کے ساتھ اس کو

بھی خرید لیا۔ سلام کی یہ باتیں سن کر لوگ کہتے کہ جب یہ بات ہے تو اپنے پاس کیوں نہیں رہنے دیتا۔ وہ جواب دیتا مجھے اس سے زیادہ پیسہ پیار ہے۔ علاوہ ازیں اگر میں رہنے بھی دوں تو اس کی نگرانی کون کرے گا۔ میں ایک چلنے پھرنے والا آدمی ہوں، آج یہاں کل وہاں، میں تو اس کی نگرانی کرنے سے رہا نہ یہ خود اس قابل ہے کہ اپنا خرچ آپ اٹھاسکے اور نہ میری بیوی ہے کہ اس کے حوالے کر دوں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اگر اسے اچھی غذا ملنے لگے تو اس کی ساری لاغری جاتی رہے گی، اور یہ بڑا ماہر کاریگر حسرت و چالاک اور ذہین ثابت ہوگا۔ ذرا اس کی پتلیاں تو دیکھو کس طرح پھرتی رہتی ہیں، انہیں کسی جگہ قرار ہی نہیں۔ مجال ہے جو کسی جگہ ٹھہر جائیں۔ اس کی حسرت کا تو یہ عالم ہے کہ کسی چیز پر ایک نگاہ ڈال کر کسی چھان بین کے بغیر تہ تک پہنچ جاتا ہے۔ آنکھیں آگ کے شعلوں کی طرح چمک رہی ہیں۔ لوگ سلام کی باتیں سن کر منہس دیتے اور غلام کو خریدے بغیر چلے جاتے، اور سلام کے دل کے ارمان دل ہی میں رہ جاتے۔ اُسے اپنی اصلی رقم بھی ڈوبتی نظر آرہی تھی۔

ایک دن صبح کو شبیتہ بنت یحیٰ اُدھر سے گذرتی ہے اور بچے کو غور سے دیکھتے ہی اس کے دل میں اُس کے خریدنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔

شبیتہ: "ابن حُبیر! تمہارے اس غلام کا کیا نام ہے؟"
 سلام: میں نے اسے ایک کلبی سے خریدا ہے، وہ اس کا نام سالم بتاتا تھا۔"

شبیتہ: "سالم کس کا بیٹا ہے؟"

سلام: "باپ کا نام تو مجھے معلوم نہیں، لیکن جس سے میں نے خریدا ہے اس کا نام معقل ہے، اس کا خیال تھا کہ اس بچے کا خاندان بڑا شریف اور اعلیٰ ہے۔ یہ خاندان اصطخر سے....."

شبیتہ: "اچھا، اصطخر سے آیا تھا اور آبلہ میں آباد ہو گیا وہاں اپنی زرعی اراضی میں بیٹیوں سے کام کرایا، اور اطرافِ عراق میں دُور دور تک کاروبار پھیلا دیا۔ یہ باتیں تو ہمیں معلوم ہیں۔ میں اسے خریدنا چاہتی ہوں، بولو اس کے کتنے پیسے ہوں گے؟"

یہ سن کر سلام کا دل باغ باغ ہو گیا اور خوشی سے بالسنوں اُچھلنے لگا۔ سلام: "مسکرا کر سنجیدگی اور بردباری سے" زیادہ پیسے نہیں لوں گا، اب تم سے کیا نفع لوں۔ بس اتنے ہی پیسے دے دو جتنے میں نے

خریدار ہے، اور جتنی رقم اب تک اس پر صرف ہوئی ہے،
 ثبیتہ: آخر بتاؤ تو یہی کیا لوگے، کچھ دیر تک دونوں میں بھاؤ تاؤ
 ہوتا رہا، اور پھر سودا ایک جگہ آکر طے ہو گیا۔ ثبیتہ غلام کو اپنے
 گھر لے آتی ہے۔ یہودی کو اس غلام سے بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن
 ثبیتہ کے فائدے کی توحید و انتہا ہی نہیں۔ ثبیتہ کا نفع اشرافیوں
 سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ کیونکہ اس نے غلام کو تجارت کی غرض
 سے نہیں خریدا۔ بلکہ اس کا مقصد نیکی اور سلوک کے سوا اور کچھ
 نہ تھا۔ اور ایک نیکی کا اندازہ اس بات سے لگا لو کہ وہ دنیا کی
 بادشاہت سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ثبیتہ غلام کو گھر لا رہی ہے
 اور دل ہی دل میں کہتی جا رہی ہے۔ تفت ہے ایسی زندگی پر
 جس میں انسان انسان پر رحم نہ کھائے اور لعنت ہے ایسی
 دنیا پر جہاں طاقتور کمزور کو ہڑپ کر جائے۔ افسوس ہے ان لوگوں
 پر جو کسی خاتون کے بچے کو اغوا کر لیں اور پھر دل بن جائیں، اور
 لعنتی ہیں وہ لوگ جن کو بکیس عورتوں پر رحم نہ آئے جو اپنے
 ایسے لاڈلے کو کھو کر اور رودھو کر بیٹھ جائیں جو ابھی پرورش
 کا محتاج ہے، نہ اُسے مال کی خبر ہے اور نہ باپ کی اور نہ کسی
 اور عزیز و آشنا کی کہ اُس کی پناہ لے لے۔ اگر اسی طرح میرا بچہ

ہوتا اور خدا نخواستہ لیٹرے حملہ کر کے میرے بچے کو اغوا کر کے لے جاتے، تو ہائے اس وقت میرے دل پر کیا گذرتی اور چھاتی پر کیسے کیسے سانپ لوٹتے ہیں اپنے لال کی جدائی کیسے برداشت کرتی اور مجھے کیسے صبر و سکون آتا کیا میں اپنے لاڈلے کو بھول جاتی، اور عمر بھر میرا دل اسے نہ ڈھونڈ پھتا رہتا ہائے ہائے اگر میرا بچہ ہوتا اور خدا نہ کرے اسے ظالم اٹھا کر وطن سے دور لے جاتے تو میری صبح و شام اسی کی یاد میں بسر ہوتی۔ میں سوتے جاگتے اسی کو یاد کرتی رہتی۔ اپنی جان کو اس کی خاطر گنوا دیتی، اور اسی کے دھیان میں روتے روتے مر جاتی۔ مجھے اس زندگی میں کیا لطف آتا جو مجھے آٹھ آٹھ آنسو رولاتی، اور میرے لال کو مجھ سے چھین کر دشمنوں کے حوالے کر دیتی۔ جب ثبیتہ تصور کے اس مقام تک پہنچ گئی تو اس کی آنکھوں میں پکے کی ماں پھرنے لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر آنے لگا کہ ایک مظلوم ماں اپنے بچے کو سینے سے لگائے ہوئے ہے، ایک لیٹرہ آکر زبردستی اس سے اس کا بچہ چھین لیتا ہے، ماں روتی دھوتی رہ جاتی ہے، ظالم بچہ کو لے کر چھپت ہو جاتا ہے۔ ثبیتہ کی آنکھوں میں اس بیٹا کی ماری ماں کی آہ و زاری

اس کا دل ہلا دینے والا شور و شیون، اس کا ٹرپنا، اُس کا منت
 حاجت کرنا، اس کے دل کی نہ بچھنے والی آگ، اُس کی مامتا اور
 اس کے نہ خشک ہونے والے آنسو پھر رہے ہیں۔ پھر دل ہی
 دل میں کہتی ہے کہ جب یہ بچہ کسریٰ کے ملک سے اغوا کر لیا گیا
 اور کسریٰ کا لشکر جرار اس کو ظالموں سے نہ چھڑا سکا، تو ہم بیچارے
 مری کس گنتی میں ہیں، یہ شہر تو پہلے ہی سے خوف زدہ ہے جس کو
 یاروں طرف سے یہودی اور دیہاتی گھیرے ہوئے ہیں، جس کے
 لشکر ذرا ذرا سی بات پر ایک دوسرے پر ہاتھ صاف کرنے
 و تیار رہتے ہیں، اور حوادثِ ایام سے کبھی محفوظ و مامون نہیں رہتے۔
 ثبیتہ جب گھر ہو چکے تھوڑی دیر سستالیتی ہے تو بچے پر مامتا
 بھری نگاہ ڈال کر اُس سے اُس کا دل بہلانے کے لئے ہنس مہنس کر
 باتیں کرنے لگتی ہے۔ بچہ محبت و شفقت دیکھ کر مانوس ہو جاتا ہے
 اور اطمینان سے پیٹا بھر کر کھانا کھاتا ہے۔ پھر کچھ سوچ کر اپنے
 دل ہی دل میں کہنے لگتی ہے، بھلا میں کیوں شادی کرنے لگی۔ خدا
 نہ کرے ماں کی مامتا اور بچے کا تو یہ حشر ہے، ایسی شادی اور بچوں
 سے میں بھر پائی۔ مجھے خون کے آنسو رونے کی کیا پڑی ہے، جیسے اس
 بچے کی ماں اور دوسری مائیں بچوں کے غم میں روتی ہیں۔

اگر زمانہ سازگار ہوتا اور حالات اجازت دیتے تو ثبیتہ اپنے زندگی کے ایام اس فارسی بچے کی خیر خبر اور پرورش میں گزار دیتا اور اسے اپنا بیٹا اور لاڈلا بنا کر رکھتی۔

ثبیتہ سالم کا ہر طرح کا خیال رکھ رہی ہے، اور محبت و شفقت سے اس کی پرورش کر رہی ہے۔ آخر کار بچہ بڑا ہو جاتا ہے اور نہایت ذکی ذہین اور سمجھدار ثابت ہوتا ہے۔ سالم اس یودی کے انداز سے کہیں زیادہ مبارک اور بہتر ثابت ہوتا ہے۔ ثبیتہ سالم بڑی محبت کرتی ہے، اور اس سے بڑی خوش ہے۔ اس بچے پر اسے بڑا ناز ہے۔

اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد ثبیتہ کے پاس اس وقت کے بڑے بڑے لوگوں کے پیام آتے ہیں، مگر وہ ایک ایک کو ٹھکرا دیتی ہے۔ مگر دو نواح کے شریف لوگوں نے بھی پیام دیا۔ مگر وہ شادی کرنے سے صاف انکار کر دیتی ہے اور بچے کی پرورش کا عند پیش کر دیتی ہے۔

اسی طرح ہفتے اور مہینے گزر جاتے ہیں۔ ثبیتہ اپنے خیال پر بدستور قائم ہے۔ اتفاق سے ایک قریشی قافلہ شام سے واپس آتا ہوا یثرب سے گزرتا ہے اور کچھ ایام کے لئے آرام کرنے کی

Marfat.com

غرض سے یہاں ٹھہر جاتا ہے۔ اس قافلے میں ابو خذیفہ، شمیم بن
 عتبہ بھی ہے۔ ابو خذیفہ اہل یثرب سے ثبیتہ کی تعریفیں سن کر
 فریفتہ ہو جاتا ہے، اور جب وہ اس بچے سالم کا واقعہ سنتا ہے
 تو بے اختیار ہو جاتا ہے اس کے دل میں مزید چھان بین کی خواہش
 پیدا ہوتی ہے۔ اس خیال سے ابو خذیفہ ثبیتہ کے قبیلے میں آ کر
 ٹھہر جاتا ہے، ان سے تبادلہ خیالات کرتا رہتا ہے، اور اندر ہی
 اندر ثبیتہ کی محبت اس کے دل میں گھر کرتی جاتی ہے۔ اس نے
 اب تک نہ ثبیتہ کو دیکھا ہے نہ اس کی کوئی بات سنی ہے۔ البتہ
 لوگوں سے اس کی تعریف ضرور سنی ہے، جس سے اسے درپردہ
 محبت ہو گئی ہے۔ آخر ابو خذیفہ بڑے شوق و ذوق سے اپنا پیام
 بھیجتا ہے، ثبیتہ حسب دستور اسے مسترد کر دیتی ہے۔ لیکن جب
 اسے ابو خذیفہ کا قریشیوں میں مقام و مرتبہ معلوم ہو جاتا ہے اور یہ
 تحقیق ہو جاتی ہے کہ ابو خذیفہ شریف و عزت دار قریشی ہے،
 علاوہ ازیں اس بیت اللہ کا مجاور و پاسبان بھی ہے جس پر حملہ
 کرنے کے لئے اصحابِ نبیل آئے تھے اور خدا نے انہیں دلیل
 و حواہر کے نکال بھگایا، تو اس کا دل رفتہ رفتہ اس کی طرف
 مائل ہو جاتا ہے۔ اور ابو خذیفہ کا پیام قبول کر لیتی ہے۔ چنانچہ دونوں

کی رسم نکاح ادا ہو جاتی ہے۔ پھر ابو خذیفہ اپنی اہلیہ ثبیقہ اور اس کے غلام سالم کو ساتھ لے کر قافلہ کے ساتھ مکہ واپس آ جاتا ہے، ابھی آئے ہوئے کچھ دن ہی گزرے تھے کہ وہ مکہ میں نئی نئی باتیں دیکھتا ہے۔ ایک دن ابو خذیفہ صبح کو قریشیوں کی بیٹھکوں میں پہنچ جاتا ہے، پھر شام کو بھی جا کر شریک ہو جاتا ہے۔ اسے ان مجلسوں میں بہت سی باتیں تو پہلے کی طرح نظر آتی ہیں۔ لیکن بہت سی باتوں میں تغیر نظر آتا ہے۔ اس کی تمنا ہے کہ اسے پہلے کی طرح امن و چین سکون و دل جمعی اور اطمینان و تسلی میسر آئے۔ لیکن افسوس اسے یہ قلبی اطمینان کسی قیمت پر بھی حاصل نہیں۔ وہ محسوس کر رہا ہے کہ ان مجلسوں میں کچھ کمی سی ہے، اور مکہ میں کوئی انقلاب سر اٹھا رہا ہے، خدا ہی جانتے وہ چھوٹا ہے یا بڑا۔ لیکن اس نے قومی نظام کو درہم برہم کر رکھا ہے، جو محسوس تو ہوتا ہے لیکن اس کی جڑیں نامعلوم ہیں۔ پھر وہ اپنے بعض دوستوں کو مجلسوں میں ڈھونڈتا ہے لیکن وہ نظر نہیں آتے۔ حاضرین سے پوچھتا ہے عثمان بن عفان اموی کہاں ہیں؟ طلحہ بن عبید اللہ شریقی نظر نہیں آ رہے، اور میرے فلاں فلاں دوست موجود نہیں ہیں۔ آخر یہ لوگ کیوں نہیں آتے۔ لیکن لوگ کھل کر جواب نہیں دیتے۔ بعض

ٹوچپ سا دھ جاتے ہیں، اور بعض ایک مہم سی بات کر کے
 خاموش ہو جاتے ہیں۔ ابو خدیفہ حیرت سے ہر ایک کا منہ تکتا رہتا،
 اور اس کی بے چینی و بے قراری میں دم بدم اضافہ ہی ہوتا چلا
 جاتا ہے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے اُسے خیال آیا کہ میرے تمام
 دوست آخر تکے ہی میں تو ہیں، اُسے معلوم ہے کہ وہ حرم کو چھوڑ کر
 کہیں نہیں جاسکتے۔ اس لئے وہ دل ہی دل میں کہتا ہے کہ
 میں براہِ راست ہر ایک سے کیوں نہ ملوں، کچھ نہ کچھ بات تو
 سامنے ضرور آئے گی۔ یہ سوچ کر وہ عثمانؓ کے گھر پہنچتا ہے،
 اور ان کا دروازہ جا کھٹکھٹاتا ہے۔ عمروں کے تفاوت کے باوجود
 دونوں میں گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ عثمانؓ چالیس سے
 آگے بڑھ گئے تھے، اور ابو خدیفہ ابھی تیس برس کا بھی نہ ہوا تھا
 لیکن ان دونوں میں بہت پرانی اور گہری دوستی تھی، جسے
 رفاقتِ سفر نے اور بھی گہرا اور مضبوط بنا دیا تھا۔ حضرت
 عثمانؓ اپنے دوست کا پر تپاک اور پر جوش استقبال کرتے
 ہیں اور غندہ پیشانی سے اُسے خوش آمدید کہتے ہیں۔ ابو خدیفہ
 عثمانؓ میں بھی کچھ تغیر اور سنجیدگی رو نما دیکھتا ہے۔
 ابو خدیفہ: (چونک کر) ابو عمرو! میں تو جب سے آیا ہوں برابر قریشی

مجلسوں میں تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں، تم تو عید کا چاند ہو گے
 کہاں ہو اور کیا بات ہے، بیٹھکوں میں کیوں آنا جانا چھوڑ دیا؟
 عثمان: ”مجھے ان مجلسوں سے کوئی دلچسپی نہیں نہ میں ان باتوں
 کو پسند کرتا ہوں جو وہاں ہوتی رہتی ہیں۔“
 ابو خدیفہ: ”کیا آپ کو قوم کی کوئی بات ناگوار گذری۔ یا ان سے کوئی
 تکلیف پہنچی؟“ عثمان خاموش ہو جاتے ہیں اور جواب نہیں دیتے۔
 ابو خدیفہ پھر وہی بات دہراتا ہے۔ لیکن اس بار بھی وہ خاموش
 ہی رہتے ہیں۔

ابو خدیفہ: ”ابو عمرو! لات وغری کی قسم کوئی نہ کوئی بات تو ضرور
 ہے، کچھ نہ کچھ ضرور دال میں کالا ہے۔“ ابو خدیفہ کی قسم سن کر عثمان
 کی پیشانی پر تل پڑ گئے، اور انہوں نے منہ پھیر لیا۔ ابو خدیفہ نے
 غور سے ان کے چہرے پر نگاہ ڈالی، تو دوست کے تیور بدلے بدلے
 سے اور چہرے پر خفگی کے آثار سے نظر آئے جو اس قسم سے پہلے
 نہ تھے۔

ابو خدیفہ: ”ابو عمرو! ذرا سوچو تو ہم دونوں میں کتنا گہرا اور پرانا
 رشتہ دوستی کا ہے، تم میرے دوست اور ہمزاد ہو، اپنے دل
 کی بات مجھے بتا کیوں نہیں دیتے؟“

عثمان :- (انتہائی نرمی اور اطمینان والی آواز میں) "ابو خدیفہ! اگر دو ستانہ تعلقات باقی رکھنا چاہتے ہو تو لات و غزی اور جھوٹے دیوتاؤں کا ذکر مت کرو، لات و غزی تمہارے کام آنے والے نہیں، نہ ان سے تمہیں کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ یہ سُن کر یہ سُن کر ابو خدیفہ بیچ و تاب کھا کر اور دل ہی دل میں گھٹ کر یہ ابو خدیفہ :- "ہائیں تم بے دین ہو گئے، ابو عمرو!"

عثمان :- (محبت بھرے اور مشفقانہ لہجے میں) "ابو خدیفہ! تم عجیب آدمی ہو، تمہیں نہیں نہیں میں لے دین نہیں ہوا، میں تو سیدھی راہ پر چل پڑا ہوں، ماشاء اللہ تمہاری ابھی کچھ زیادہ عمر بھی نہیں ہے بیدار مغز اور ہوشیار ہو، جگہ جگہ کا پانی پی چکے ہو، تم نے ایک نیا دیکھی ہے، لوگوں کے حالات سے واقف ہو، مصائب و حوادث سے دوچار ہو چکے ہو، اور نشیب و فراز جانتے ہو۔ ذرا سوچو تو سہی، کیا یہ عظمتی کی بات ہے کہ تمہارا جیسا شخص یا مجھ جیسا آدمی ان پتھروں اور لکڑیوں کے بت پوچھے جنہیں انسان نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے اور اگر چاہے تو انھیں توڑ پھوڑ بھی سکتا ہے۔"

ابو خدیفہ :- (کچھ سوچ کر) ابو عمرو! آپ کی بات سراور آنکھوں پر،

انہماقی ہا تشندانہ بات ہے، لیکن دیوتاؤں کے بارے میں میں نے
 آج تک غور نہیں کیا، جیسا قوم کو دیکھا ویسا ہی میں بھی کہنے لگا
 عثمانؓ: اللہ نہیں بڑے خیر دے، اب جبکہ ہدایت کھل گئی، اور
 حق بات ظاہر ہو گئی تو اب کیا دیر ہے؟

ابو حذیفہ: دیر ویر ویر کچھ نہیں، ہمیں حق کی پیروی کرنی پڑے گی اور
 ہدایت کی راہ پر چلنا پڑے گا، اچھا! اب کب محمدؐ کے پاس جاؤ گے؟
 عثمانؓ: اگر چاہوں تو ابھی چلے جاؤں۔

آخر کار شام کو ابو حذیفہ حضرت عثمانؓ کے ساتھ مہر کار رسالت
 کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو جاتے ہیں۔ مسلمان
 ہو کر شبیتہ کے پاس آتے ہیں، اور اسٹھیں بھی اسلام کی ترغیب
 دلاتے ہیں۔ وہ بھی مسلمان ہو جاتی ہیں، اور شام بھی دونوں
 کی باتیں سن کر اسلام کی دولت سے مالا مال ہو جاتے ہیں۔
 اس طرح آج کی رات آنے سے پیشتر مکہ میں ایک اور اسلامی گھرانے
 کا اضافہ ہو گیا۔ اس گھرانے کو ابھی اسلام لانے ہوئے کچھ ہی دن
 گزرے ہوں گے کہ شبیتہ کو معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ علیہ
 الصلوٰۃ والسلام غلام آزاد کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، اور آنا
 کرنے والوں کو اللہ کی مغفرت، رحمت اور رضامندی کی خوشخبری

دیتے ہیں۔ یہ مسننے ہی تبتیہ اپنے فارسی غلام کو بلا کر کہتی ہیں :-
 شبلیہ، سالم جاؤ میں نے اللہ کی رضا مندی کے لئے تمہیں آزاد
 کر دیا، اب تمہیں اختیار ہے جسے چاہو اپنا ولی بنا لو۔
 سالم :- (ابو حذیفہ سے) "کیا آپ میرے ولی بن کر شکر یہ کا موقعہ
 عنایت فرمائیں گے؟"

ابو حذیفہ :- (پیارے سے) نہیں نہیں سالم، میں تمہارا ولی کیوں بننے
 لگا، میں نے تمہیں آج سے اپنا بیٹا بنا لیا، تم مجھے اپنا باپ سمجھو۔"



ہمیں جان و دل سے ہیں پیارے محمد

محمد عربی کا برو سے ہر دوسرا است
کسیکے خاک درش نیست خاک بر سر او

عبداللہ بن سہیل اپنی ہمشیرہ سہلہ بنت سہیل سے (جو ابو خدیفہ
کی اہلیہ ہے) اپنے بہنوئی ابو خدیفہ کے گھر ملتے آتا ہے۔ سہلہ اپنے
بیانی کا پرتباک خیر مقدم کرتی ہے، اور بڑی گرم جوشی سے اس
سے ملتی ہے، اور خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتی۔
بیانی اپنی بہن سے خلاف توقع غیر معمولی آؤ بھگت دیکھ کر باغ
باغ ہو جاتا ہے۔ اور اُسے خوش کرنے کے لئے اپنی قوم اور اپنے
خاندان کے دلچسپ واقعات چھیڑ دیتا ہے۔ عبداللہ کی باتوں
سے بھول جھڑتے تھے اور جس طرح بزرگ اور عمر رسیدہ لوگ
سُن کر خوش ہوتے تھے اسی طرح نوجوان اور بچے سُن کر کھل جاتے
تھے۔ اس کی بہن بھی بڑے شوق سے اُس کی دلچسپ باتیں

سنا کرتی تھی اور منہستی رہتی تھی، کئی بار اُس نے ارادہ بھی کیا کہ
 وہ بھی اپنے بھائی کی باتوں میں شریک ہو کر گذرے ہوئے بچپن کے
 زمانے کی یاد تازہ کر لے۔ مگر نہ معلوم کیا سوچ کر حُب سادہ لیتی ہے
 اور بھائی سے مزید باتیں کرنے کی فرمائش کرتی ہے۔ عبد اللہ کو ایسا
 محسوس ہوا جیسے اُس کی بہن کچھ کھوئی کھوئی سی رہتی ہے۔ کبھی تو
 اُس کا دماغ حاضر رہتا ہے اور کبھی بالکل خود فراموش سی معلوم ہوتی
 ہے۔ اسے اپنی ہمیشہ کی خود فراموشی اور دماغ کی حاضری پر بڑا تعجب ہوا
 لیکن عبد اللہ نے یہ خیال اپنے دل ہی دل میں رکھا، اُس پر ظاہر
 نہیں ہونے دیا۔ حسب عادت بات چیت میں منہس منہس کر کرتا رہا، اور
 سننے والوں کو بھی منسا تا رہا۔ جب ایک طویل مدت تک اس سے
 باتیں کر لیں، تو اب گھر جانے کے ارادے سے اُٹھا۔ اُس کی ہمیشہ
 بھی رخصت کرنے کے لئے دروازے تک آئی۔ عبد اللہ نے بہنوئی
 کا گھر چھوڑنے سے پہلے اپنی ہمیشہ کی طرت جھک کر اُسے گلے لگانے
 اور جوم لینے کا قصد کیا۔ سہلہ بھائی کا غم بھانپ کر گھبرا سی گئی
 اور تیسرے کھسک گئی۔ یہ ماجرا دیکھ کر عبد اللہ حیرت و استعجاب میں
 غلطاں و پچاں اُسے ٹکنے لگا، اور وہ بھی گھرائی گھرائی نگاہوں سے
 عبد اللہ کو دیکھنے لگی۔ آخر عبد اللہ اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا اور سہلہ حیران

و پریشان کلری سوچنے لگی کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ آخر تھوڑی دیر کے بعد عبداللہ اس سکوت کو توڑتا ہے:

”سہلہ! آج تمہاری کچھ عجیب سی حالت معلوم ہو رہی ہے، کیا تم نے کل ہجرت کا پکا ارادہ کر لیا ہے؟“
 سہلہ: ”رگھبر! کیا کیسی ہجرت؟“

عبداللہ: ”دہنس کر“ جیسے تم کچھ جانتی ہی نہیں، ابھی دودھ ہی پیتی ہو، کیسی بھولی بھالی اور سیدھی سادی ہو، بھائی سے کیا چھپا رہی ہو ہجرت کی خبر تو الم نشرح ہو چکی، ہر شخص کی زبان پر ہجرت ہے۔ قریشی اپنی مجلسوں میں اسی کا ذکر کر رہے ہیں۔ اس بات سے بچ بچ وقت ہے۔ اگر قریشی سردار چاہتے تو محمد کے ساتھیوں کو ہجرت نہ کرنے دیتے مگر وہ ان سے تنگ آگئے ہیں، اور ان کا ہجرت کر جانا ہی بہتر جانتے ہیں، وہ محمد سے اور ان کے ساتھیوں سے تنگ آگئے۔ غلاموں اور حلیفوں کو منزائیں دیتے دیتے ٹھک گئے مگر وہ کم نجت مانتے ہی نہیں۔ اب قریشی سردار بڑے پریشان ہیں ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا، آخر کریں تو کیا کریں، اس لئے ان لوگوں کی ہجرت سے وہ خوش ہیں، بلکہ ان کا تو یہ کہنا ہے کہ ہجرت سے ہمارے سر سے بلا ٹل رہی ہے اور ہمیں سکون خاطر اور دلجمعی نصیب

جو رہی ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ وہ محمد اور ان کے ساتھیوں سے بے خبر
 ہیں، منٹ منٹ کی خبر رکھتے ہیں، رات پھر پھر دے دے کر
 کاٹ دیتے ہیں۔ اگر یہ لوگ چاہیں تو ان کی ناکہ بندی نہایت آسانی
 سے کر سکتے ہیں، بس غریب غربا تو ان کی قریشیوں کو برواہ
 ہی نہیں۔

سہلہ اپنے بھائی سے یہ تمام باتیں نہایت غور سے سن رہی
 تھی، اور اس کا چہرہ خوف و دہشت اور لیج و غم کی ترجمانی کر رہا
 تھا، کبھی تو اس کا چہرہ فق ہو جاتا اور کبھی کھل کھلا اٹھتا مگر خاموش
 کھڑی سنتی ہی رہی۔

عبداللہؓ: غالباً تمہارا اور تمہارے شوہر کا یہ خیال ہے کہ قریشی
 تم سے بے خبر ہیں، نہیں نہیں، ایسا نہیں ہے، تم لوگوں نے
 تو ان پر نیند بھی حرام کر رکھی ہے۔ تمہیں خبر کیا ہے عتبہ اور ولید
 ابو خدیفہ کے حالات سے اس طرح واقف ہیں جیسے سہیل اور
 عبداللہؓ اپنی سہلہ کی ہر ہر بات سے خبردار ہیں۔ اور یہ دونوں
 ہی نہیں بلکہ سارے قریشی تم دونوں کی سرگرمیوں اور ارادوں
 سے رتی رتی واقف ہیں۔ جیسے تمہارے ابا جان واقف ہیں۔
 البتہ تمہیں یہ خوش خبری سنائے دیتا ہوں کہ وہ تمہیں تمہارے

باپ اور بھائیوں کے لحاظ سے ہجرت سے نہیں روکیں گے۔
 عود ہمارا بھی تمہاری راہ میں حائل ہونے کا خیال نہیں کیونکہ تم
 ہمارے عزیز ہو اور ہم دل و جان سے تمہیں چاہتے ہیں ہمارے
 دل کی گہرائیوں میں تمہاری محبت سے لیکن پھر بھی ہیں تمہاری یہ
 پوشیدہ زندگی گوارا نہیں، تم کب تک اس طرح چھپ چھپ کر
 زندگی گزارو گے، اور کب تک تنگ و ترشی کے ساتھ زندگی
 کے دن بناؤ گے۔ ہمیں تو اس بات کی مسرت ہے کہ تم ہجرت
 کر کے جہاں جاؤ گے۔ امن و امان سے اور آسائش و آرام
 سے آسودہ حال اور فارغ البال رہو گے۔ اگر تمہیں بے خوف
 ہو کر اطمینان سے روزی ملے تو ہمارا کیا حرج ہے۔ اگر قریشی یہ بات
 نہ کہتے کہ سہیل کمزور ہے بیٹی کی جدائی برداشت نہ کر سکے گا۔
 تو میں اس وقت تنہا تم سے ملنے نہ آتا بلکہ تمہارے والد بھی ضرور
 میرے ساتھ ہوتے اور جدائی سے پہلے ایک نظر تمہیں دیکھ کر
 اپنے گہرے غم کو ہلکا کر دیتے اور تم سے آنکھیں ٹنڈی کر لیتے
 آہ جدائی بھی ایسی جدائی جس کی مدت نامعلوم، جس کی مدت کی
 خبر نہیں کہ مہینے دو مہینے کی ہے یا سال دو سال کی یا ہمیشہ ہمیش
 کی۔ ہم سب کو جدائی کا آغاز معلوم ہے لیکن اس کے انجام سے

بے خبر ہیں۔ مجھے اپنے باسے میں قریشیوں کی قیاس آرائیوں کی بالکل پرواہ نہیں، میں تو ان کے عقدہ کو عین ٹھنڈک اور ان کی نظر حقارت کو نظر عظمت سمجھتا ہوں، تم نے میری ساری رام کہانی سن لی۔“

سہلہ: (لہزدتی ہوئی آواز میں) ہاں، بھائی جان، خوب سن لی۔
عبداللہ: (سنجیدگی سے) اچھا، تو پھر اب کیا خیال ہے؟
سہلہ: بھائی جان! آپ نے حور کیا ہو گا کہ جب سے آپ تشریف لائے ہیں، آپ ہی اپنی باتیں کئے چلے جا رہے ہیں، میں نے تو آپ کی کسی بات کا جواب ہی نہیں دیا۔“

عبداللہ: (دہنایت متانت سے) ہاں، اسی بات نے تو مجھے تعجب میں ڈال دیا ہے، میری سمجھ میں اب تک تمہاری گھبرائٹ کا سبب نہ آسکا۔ جب میں تم سے گلے مل کر رخصتی بوسہ دینا چاہ رہا تھا تو تم گھبرا سی گئی تھیں، اور پیچھے کو کھسک گئی تھیں۔ آخر اس کا کیا مطلب تھا، بتاؤ تو سہی۔“

یہ سن کر سہلہ اپنی ہنسی کو مشکل سے ضبط کر کے بولی:-
”بھائی جان! بھرا نہ مانتا آپ مشرک ہیں اور مجھے مشرکوں کا چھوٹا گوارا نہیں۔“

عبداللہؑ۔ (کمال متانت سے) تو کیا محمدؐ کی محبت اور ان کے دین کی محبت نے تمہیں یہ سکھایا ہے کہ تم اپنے بھائیوں سے نفرت کرو؟

سہیلہ، (کمال سنجیدگی سے) "جب ہمیں اپنے پیارے رسول سے اور ان کے دین سے انتہائی محبت ہے اور ہمارے باپ بھائی مشرک ہیں، تو ان سے نفرت کرنا کوئی اچھے کی بات نہیں۔ بھائی جان! یقین مانو، ہمیں اپنے باپ سے، ماں سے، بھائی سے اور ہر رشتہ دار سے، بلکہ خود اپنی جان سے کہیں زیادہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت ہے، خدا کی قسم وہ تو ہمیں دنیا و ما فیہا سے زیادہ پیارے ہیں۔
 محمدؐ کی محبت بخرو ایمان، جان ایمان ہے
 محمدؐ کی محبت روح ایمان، شان ایمان ہے

تم نے ابھی ابھی فرمایا تھا کہ قریشی ہماری ہجرت سے خوش ہیں اور مسرت کے شاد دیا نے بجا رہے ہیں۔ خدا کی قسم ہم ہجرت سے ایک سکندڑ کے لئے راضی نہیں۔ اگر ہمارے محبوب پیغمبر ہم کو ہجرت کا حکم نہ فرماتے تو ہم آپ ہی کی خدمت میں رہ کر ہر طرح کے دکھ، تکالیف اور سزائیں خوشی خوشی برداشت کر لیتے اور ہر قربانی کے لئے تیار رہتے۔ خاک پڑے اس آسائش پر اور خوشحالی پر

جو آپ سے دُور رہ کر میسر آئے، اور تفت ہے ایسے آرام
 آپ سے بچ کر ہاتھ آئے نہ

دم نکل جائے تو چھوڑوں غم کے ہاتھوں سے کہیں
 خاک ایسی زندگی پر ہم کہیں اور تم کہیں

آپ کے پاس رہ کر ہر تکلیف عین راحت ہے، اور آپ سے جدا ہونے
 دنیا بھر کی راحت و حقیقت کلفت ہی کلفت ہے۔

عبداللہ (منعجب ہو کر سوچتا ہے) اچھا، تو یہ بات ہے، محمد نہیں ہر چہ
 سے پیارے ہیں؟

سہیلہ: (ممانت و سنجیدگی سے) بھائی جان! تمہیں اس محبت کی حلاوت

معلوم نہیں، اگر تم بھی ہماری طرح ان سے محبت کرنے لگو تو تمہارا
 دل بھی اس کی منہاس سے آشنا ہو جائے، اگر تم بھی انہیں

چاہنے لگو تو پھر تمہیں اندازہ ہو گا کہ یہ کیسی بیش بہا دولت سے
 ملے اس محبت کی تو قیمت ہی خندہ پیشانی سے چرکے پر چرکے

کھاتے رہنا اور آف تک نہ کرنا ہی ہے۔ جب تم اس وادی میں
 قدم رکھو گے تو اس محبت کی خاطر ٹھوکروں میں بھی لذت پاؤ گے

ایک محب کے لئے محبوب کی خاطر پتھر بھی پھول ہیں۔ یہاں
 پتھروں کی بارش ہوتی ہے پھولوں کی نہیں۔

اتنے میں ابو خدیفہ بھی آجاتے ہیں۔ عبداللہ کو ایک گہرے
فکر میں ڈوبا ہوا پاتے ہیں، اور سہلہ کو اس کے پاس چپ چاپ
کھڑا ہوا دیکھتے ہیں جو عبداللہ کو محبت بھری اور موثر نگاہوں سے
نک رہی ہیں۔ ابو خدیفہ نے پہلے تو اپنی رفیقہ حیات پر نگاہ ڈالی
پھر ان کے بھائی کو غور سے دیکھا اور پھر اونچی آواز سے فرمانے لگے۔
”سہلہ کیا مجھے بتا سکو گی کہ خدا نے ہمارے بھائی کے دل پر سکینت
نازل فرما دیا؟“ ابو خدیفہ نے بے صبری اور بڑے اشتیاق سے
پوچھا۔ ابھی سہلہ جواب بھی نہ دینے پائیں تھیں کہ عبداللہ فوراً
بول پڑا:

”سکینت... سکینت... یہ آخر ہوتی کیا ہے۔ تمہاری زبانوں
پر چند مرعوب کن الفاظ جاری ہو گئے ہیں جن سے ہمارے کانوں
کو کھڑکھڑاتے رہتے ہو لیکن ہم انہیں خاک بھی نہیں سمجھتے! ابھی
یہ کہا جا رہا تھا کہ اللہ کے نبی ہمیں سب سے پیارے ہیں، اور ابھی
تم ان سے یہ پوچھ رہے ہو کہ کیا خدا نے میرے دل پر سکینت نازل
فرما دیا؟“ خدا را مجھے بتا دو کہ یہ سکینت کیا چیز ہے۔ محمد نے تم پر
جادو کیے تمہارے دلوں کو ایسا گردیدہ بنا لیا کہ اب ان میں
خونی رشتوں کی بھی گنجائش نہیں رہی۔“

ابو خدیفہ نے کہا: نہیں نہیں، جادو وادو کچھ نہیں، یہ سب تو بہات
 ہیں، انھوں نے ہمارے دلوں پر کچھ نہیں کیا، البتہ گمراہی سے ہمیں
 بچالیا، گندے عقیدوں اور ناپاک خیالات سے پاک و صاف بنا دیا
 اب ہمارے دلوں پر سکینت اتر آئی ہے، اور وہ سوچ کی طرح
 روشن ہو گئے ہیں۔ ان میں ایمان، یقین، اعتماد اور توکل پھیل گیا ہے
 اور وہ پاکیزہ خیالات کے نشیمن بن گئے ہیں، اب خوف، رعب
 شکوک، شبہات، اوہام اور نا اُمید یوں کا وہاں گزر نہیں ہوتا
 پیر ابو خدیفہ نے یہ رتیں پڑھا کر سنائیں:-

اِنَّ الدِّينَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاءَنَا وَرَضُوا بِالْحَيٰوةِ
 الدُّنْيَا وَاطْمَأْنُوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا
 غٰفِلُوْنَ ۝ اُوْذِيْكَ مَا وَاوَاهُمُ النَّارُ مِمَّا كَانُوْا
 يَكْسِبُوْنَ ۝

یونس ۸۰، ۸۱

جو لوگ ہم سے ملنے کا یقین نہیں رکھتے اور دنیوی زندگی
 پر مطمئن ہیں اور جو لوگ ہماری آیتوں سے بے خبر ہیں
 ایسے لوگوں کا ٹھکانا ان کے عملوں کی وجہ سے آگ ہے
 عبد اللہ شریہ آیتیں سن کر پسینہ پسینہ ہو گیا۔ اُس کے بدن کا
 رُواں رُواں کھڑا ہو گیا۔ اُس کا بدن کانپنے لگا اور اُس کا دل

زور ندر سے : طرکے لگا۔ پھر ابو حذیفہ یہ آیتیں تلاوت فرماتے

ہیں :-

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ
 رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ كَجُرِيِّ مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ
 فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ دَعَاؤُهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ
 اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ فِيهَا سَلَامٌ وَأَخْرَجَهُمْ
 أَنْ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ○

(پولس - ۱۰-۱۰۰)

یقین مالمو جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک کام کئے،
 ان کا رب انہیں ان کے ایمان کی وجہ سے ان کے مقصد تک پہنچا
 دے گا، یعنی چین والے باغوں میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی
 ان کے منہ سے سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ نکلے گا۔ اور ان کی باہمی دعا السلام
 علیکم ہوگی، اور ان کی اخیر بات الحمد للرب العالمین ہوگی۔
 پچھلی آیتیں سن کر عبد اللہ کو تسکین ہوئی، گھبراہٹ دور ہوئی
 اطمینان قلب میسر آیا۔ اسے دل مبارک ہو تجھ پر بھی ان کی سکینت
 اتنی شروع ہوگئی ہے۔ ابو حذیفہ اپنے محبوب نبی کے پاس
 مجھے بھی لے چلو، میں بھی یہ مبارک کلام ان سے پڑھ لوں۔ عبد اللہ

نے ابو خدیفہ کی طرف دیکھ کر اور مسکرا کر ظریفانہ انداز میں کہا۔
 عبداللہ سرکار رسالت کے دربار میں ہیں، ابو خدیفہ بھی ساتھ
 ساتھ ہیں کہ اچانک کلمہ شہادت اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللّٰهُ
 وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ پڑھ کر مسلمان ہو جاتے ہیں۔ سبحان اللہ
 صبح کو کافرا اور شام کو مسلمان۔ آج عبداللہ سہیلہ، ابو خدیفہ اور س
 سے قرآن پاک سیکھ رہے ہیں۔ جب رات کو گھر جانے کا غم کرتے
 ہیں تو ان کی ہمشیرہ پوچھتی ہیں:

”بھائی جان! کیا آپ بھی ہمارے ساتھ ہجرت کریں گے؟“
 عبداللہ سہیلہ کچھ آزدہ ہو کر ”کیوں نہیں، بھلا تم سے دور رہ کر کس طرح
 زندگی کے دن کاٹوں گا۔ لیکن ایک رکاوٹ ابھی ہے۔ میں نے
 آج ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سنا ہے، اور آج
 ہی گفتگو کا شرف حاصل کیا ہے۔ میری تمنا ہے کہ کچھ دنوں آپ کی
 خدمت میں رہ کر کچھ فیض اٹھاؤں۔ اس لئے تم غیر سے جاؤ
 خدا حافظ۔ ہم بھی کہیں نہ کہیں تم سے مل ہی لیں گے۔“

ابو خدیفہ، سہیلہ اور سالم کو لے کر مسلمانوں کے قافلے کے ساتھ
 نجاشی کی سرزمین میں چلے جاتے ہیں۔ پھر تھوڑے ہی دنوں کے بعد
 دوسرا قافلہ روانہ ہوتا ہے جس میں عبداللہ بھی ہوتے ہیں۔

سہیل کو بیٹے کی جدائی کا اس قدر صدمہ ہوا کہ اُس نے قومی بیٹھکوں میں آنا جانا بند کر دیا۔ دن بھر گھر میں بیٹھ کر اس کو یاد کرتا، اُس کے فراق میں روتا رہتا اور رنجور و مغموم بیٹھا رہتا، جیسے کوئی قیمتی چیز کھو گئی ہو اور دل اُسے ڈھونڈھ رہا ہو۔ جب سہیل کافی عرصے تک قریشیوں کی آنکھوں سے اوجھل رہا تو انھیں فکر ہوئی اور اس کا حال معلوم کرنے کا عزم کیا۔ چنانچہ عتبہ، شیبہ اور ابو جہل تینوں سہیل کے گھر پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ سہیل کا دل نہیں چاہتا تھا کہ انھیں اندر بلائے، مگر ان کے حقوق کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجبوراً اندر بلا لیتا ہے۔ تینوں سردار سہیل کی حالت دیکھ کر ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں۔

عتبہ ناصحانہ انداز میں بولا: ابو عبداللہ! تم نے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے، بڑے افسوس کی بات ہے، اتنا بھی صدمہ کس کام کا میرا بھی تو بیٹا چلا گیا ہے، مجھے تو اس کے جانے کا ذرا بھی صدمہ نہیں!

سہیل: افسوس! اس فتنے کا سرغنہ تمہارا بیٹا ہی تو ہے، ساری شرارت اسی کی ہے، کم بخت نے میری بیٹی کو بھی بے دین بنا دیا۔ اور میرے بیٹے کو بھی، اور دونوں کو لے کر جہنم کی طرف چمپت ہو گیا۔

ابو جہل نے ایک سرد آہ بھر کر کہا: "میں اسی دن کو روتا تھا
 اگر قریش کو اپنے لیے وقوفوں کو سیدھا کرنا آتا ہوتا تو آج تم
 دونوں کی یہ گت نہ بنی ہوتی۔ اگر قریش میری بات مان جاتے تو
 میں اس گندے درخت کی جڑ تک اکھاڑ پھینکتا۔"

شیبہ نے کہا: "ابو الحکم! ذرا عقل کے ناخن لو اور سوچ سمجھ کر بات کر
 ابھی اس کام کا وقت نہیں آیا۔"

آخر کار یہ لوگ سہیل کو باہر لے گئے اور اس کے غم غلط کرنے
 کی کوشش میں لگے رہے۔ دن بیتے، پھر مفتے بیتے، اور پھر مہینے بیتے،
 کافی دنوں کے بعد ایک دفعہ چند مہاجر مکہ آتے ہیں۔ بعض توڑنے
 کی چوٹ اپنی واپسی کا اعلان کر دیتے ہیں اور بعض اس بات کو
 چھپاتے ہیں۔ ان لوگوں میں عبداللہ بن سہیل بھی تھے۔ جب
 ان کے باپ کو ان کے آنے کی خبر ملتی ہے تو وہ ان کا بڑی
 گرم جوشی سے پرتپاک خیر مقدم کرتا ہے، بڑے شوق سے ملاقات
 کرتا ہے، اور دل بہلانے کے لئے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگتا
 ہے لیکن عبداللہ زیادہ کھل کر بات نہیں کرتے اور اپنے ایمان
 و یقین پر قائم رہتے ہیں، جیسے انھیں اپنے باپ کی باتوں سے
 کوئی دلچسپی ہی نہیں موقعہ غنیمت سمجھ کر سہیل ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہے

بر اچانک اس کے کڑیل ڈوجوان غلام عبداللہ کو گھیر لیتے ہیں۔
 در انھیں باندھ کر ایک تہہ خالی میں بند کر دیتے ہیں۔ پھر ان پر
 ن کا باپ طح طح کی سزاؤں کا دروازہ کھول دیتا ہے۔
 تیر تیر چلاؤ، تہیں ڈر کس کا ہے
 سینہ کس کا ہے مری جان جگر کس کا ہے

۲۱۴

جو رو ستم کار پیکار ڈٹوڑ دیا!

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لئے
بادلوں پہٹ جاؤ دیدوراہ جانے کے لئے

بلدہ طیبہ کی پوری تاریخ پڑھ جاؤ مگر تمہیں آج جیسا کوئی دن
نہیں ملے گا۔ پھر اس کے بعد بد سے بدتر ہی دن آتے چلے گئے۔
یہ امن والا شہر اپنی امن و امان کے لئے مشہور عالم تھا۔ یہاں
کے باشندے سیدھے سادے اور پیر امن رہ کر زندگی کے دن
گزارتے تھے۔ نہ ان میں عیاری، مکاری اور چالبازی تھی
اور نہ وہ کسی کی طرف سے دلوں میں کینہ، بغض اور عداوت لکھتے
تھے۔ تمام دن اپنے اپنے کاموں میں مہنسی خوشی مصروف رہتے
اور بے خوف ہو کر آرام سے سو جاتے۔ مال و دولت پیدا کرنے
میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنا چاہتا تھا، اور عزت و سربلندی
کے کاموں میں ایک دوسرے سے سبقت کرنے کا ارادہ رکھتا

لیکن کوئی کسی کو سستا نہیں تھا، اور نہ کوئی کسی کا دل دکھاتا تھا۔ ان کے سارے کام آرام و سکون سے چل رہے تھے۔ شہر میں ہمیں بد نظمی نہ دکھائی دیتی تھی اور نہ کوئی کسی کو مارتا پٹتا تھا۔ ان کے سارے معاملات بڑی محوش اسلوبی اور پورے عدل و انصاف کے ساتھ چلتے، اگر آپس میں جھگڑا بھی ہو جاتا تو زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے کو تھوڑا بہت برا بھلا کہہ لیتا، اور اس مقرر حد سے آگے نہیں بڑھتا تھا، لیکن لڑ جھگڑا کر پھر تیسروں کو شکر ہو جاتے اور ایک دوسرے پر جان چھڑکنے لگتے۔ گردو نواح کے عرب اور خانہ بدوش قبائل مکہ والوں کی زندگی پر رشک کرتے تھے اور ان کی عظمت کے لئے ان کے دل جھک جاتے تھے۔ سارا ملک مکہ والوں پر گرویدہ اور فریفتہ تھا اور ان کے پاس بڑی بڑی امیدیں لے کر آتے تھے۔ آخر کار یہ مقدس شہر اور اس کے گردو نواح کا پورا علاقہ امن والا حرم کہلانے لگا جہاں ڈرائے ہوئے لوگ آکر نیاہ لیتے اور مظلوم کو اس کا حق دلایا جاتا لیکن آج کا دن مکے اور مکہ والوں کے لئے وہ کلنگ کا داغ ہے جو ان کی پیشانی سے دھویا نہیں جاسکتا، اور فلک کج رفتار بھی ان پر سنسنے لگتا ہے۔ آج آفتاب عالم تاب اپنی سنہری آتشین کرنوں سے مکہ کے پہاڑوں

ٹیالوں اور پیابانوں سے اٹھ کھیلیاں کر رہا ہے۔ لیکن اس کی دل لگی
 میں غیظ و غضب کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور اس کی آتشیں کرنوں
 سے کینہ و عداوت کی آگ اُٹھ رہی ہے۔ اس کی ہنسی کیا ہے،
 قہر و عتاب کا ایک نمونہ ہے اور اس کی مسکراہٹ نہیں بلکہ کٹیوں
 کے لئے تباہ و بربادی کا ایک پُر امن پیغام ہے۔ ان بچیوں کے
 دل کوئلے کی طرح سیاہ فام ہو چکے ہیں جن پر ضالالت کی گھٹا ٹوپ
 تارکیاں چھا گئی ہیں اور مکرو فریب اور ترمذ و سرکشی کا برسوں کا
 رنگ چڑھا ہوا ہے، ان لوگوں نے چند معصوم اور بے گناہوں پر
 وہ وہ ستم توڑے جنہیں سن کر ہی بدن کارو گنگٹا رو گنگٹا کھڑا ہو جانا
 ہے۔ آج قریشی سرزاد علی الصباح اپنی اپنی بیٹھکوں میں جا پونچتے ہیں۔
 اور حسب معمول باتوں میں لگ جاتے ہیں۔ مگر چند حضرات نہ مسجد
 میں آتے ہیں نہ مجلسوں میں پہنچتے ہیں، نہ کاروبار میں مصروف
 ہوتے ہیں، نہ شکار ہی کو جاتے ہیں اور نہ کھیل کود ہی میں لگتے ہیں
 بلکہ ان تمام باتوں سے یکسو ہو کر وہ ایک اور ہی دھن میں
 لگ گئے ہیں۔ صبح کو قیدیوں کی سزاؤں کی تیاریوں میں لگے
 ہوئے ہیں، دوپہر کو ان پر مظالم ڈھا رہے ہیں، اور شام کو اپنے
 کارناموں کو فریے لئے گریبان کر رہے ہیں، جہاں سارے قریش

جمع ہیں اور بڑی دلچسپی سے سن رہے ہیں۔ آج مکہ میں گھر گھر یا مسر، آل یا مسر، جناب اور بلال کا ذکر چھڑا ہوا ہے۔ ان چند مظلوم بے بس اور بے گناہوں پر ظالم قریشیوں نے جو ظلم و ستم توڑے ہیں بہر شخص کی زبان پر ان ہی کا ذکر ہے۔ ان بہتوں کے بارے میں قریشیوں کے نظریے مختلف ہیں۔ اکابر قریش اور عقلاء تو ابو جہل کی اس ذلیل حرکت کو انتہائی شرمناک اور ظلم و ستم کا بدترین نمونہ سمجھتے ہیں مگر یہ سوچ کر انہیں اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس سختی اور لے دے سے محمدؐ اور آپ کے ساتھی مرعوب ہو جائیں گے اور اپنی خطرناک راہ چھوڑ کر امن و سلامتی کی راہ اختیار کر لیں گے۔ علاوہ ازیں آئندہ حلیف اور غلام بے دین ہونے سے باز رہیں گے۔ کیونکہ وہ ان روح فرسا اور جگر دوز مظالم کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیں گے جو بے دنیوں، محمدؐ اور آپ کے ساتھیوں کے لئے تیار کئے گئے ہیں۔ گویا اکابر کے ضمیر تو ان شرمناک مظالم کی مذمت کر رہے ہیں دل خاموش ہیں اور زبانیں انہیں سراہ رہی ہیں۔ لیکن قریش کا جو ان طبقہ ان مظالم سے خوش ہے۔ ان میں ان کی دل لگی کا سامان موجود ہے۔ ان کی تفریح طبع کا یہ ایک اچھا وقت ہے ان کی خوش طبعی کے لئے یہ ایک بہترین موقع ہے جس میں مشغول

ہو کر وہ اپنے تلخ اوقات کو پچھو بہار، اور ہنس ہنس کر گزار رہے ہیں۔
 اس قسم کی بے ہودگیوں کے یہ لوگ عادی ہیں۔ ان کم بختوں کی
 گھٹی میں شرارت، فطرت میں خیانت اور عادتوں میں زدالت پڑی
 ہوئی ہے۔ بد معاش اور عنڈے نیکی سے زیادہ بدی کو پسند کرتے
 ہیں۔ اور دوسروں کی تکالیف و مصائب میں انھیں بڑا مزا آتا ہے۔
 یہ کم بخت جب دوسروں کو تڑپتا ہوا، بلکتا ہوا، شور و فغاں کرتا
 ہوا اور چیختا چلاتا ہوا دیکھتے ہیں تو لطف و مسرت کے مارے
 آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ عموماً نوجوان کی عقلیں خام، عادتیں
 چھجوری اور طبیعتیں گرم و پرجوش ہوتی ہیں۔ بسا اوقات کمسنگی
 اور ادھیان ان سے ظاہر ہوتا رہتا ہے، بے گناہوں کو دکھوں
 اور مصائب میں مبتلا کر کے ان کی کرب و بے چینی دیکھ کر انھیں بڑا
 لطف آتا ہے، جیسے یہ دردناک مناظر ان کی آنکھوں اور دلوں
 دو لوں کے لئے تفریح کا سامان ہتیا کر رہے ہیں۔ ظالم یہ نہیں
 سوچتے کہ کہیں کل نکلاں کو اسی قسم کے مصائب ان پر نہ ٹوٹ پڑیں
 ممکن ہے ایسی ہی کرب و بے چینی، ایسی ہی تلملاہٹ اور ایسی ہی
 جھج و پکار سے انھیں بھی واسطہ پڑ جائے، اور حریفوں کو ان پر
 بھی ہنسنے کا اور ان کا مذاق اڑانے کا موقع مل جائے۔ اگر ظالم

یہ سوچ لے کہ اگر وہ مظلوم کی جگہ ہوتا تو اس پر بھی یہی آفتیں طاری
 ہوتیں جو ان بے چارے مظلوموں پر ٹوٹ رہی ہیں۔ تو وہ ایک حد
 تک لوگوں کے ستارے سے اجتناب کرنے لگتے۔ انسان جو خیر
 اپنے لئے پسند کرتا ہے وہی اسے دوسروں کے لئے پسند کرنی
 چاہیے۔ یہ تو روزالت سے کہ کر دیا کر دیا تھو تھو اور میٹھا میٹھا ہب
 ہب۔ بہر حال نوجوان قریشی ابو جہل کی جدت طبع اور ستم تراشی
 کی داد دینے بغیر نہ رہ سکے۔ پھر مظلوموں کے صبر و تحمل اور ان
 کے ضبط و برداشت کی بھی تعریف کرتے رہے۔ انہیں اس بات
 کا بڑا تعجب تھا کہ ایک مسلمان ہر قسم کی تکلیف کس طرح کمال صبر و
 ضبط سے ہنس ہنس کر برداشت کر لیتا ہے، اور اپنے ابرو پر بل
 تک نہیں آنے دیتا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ بیچاروں کی تلملاہٹ، کسمپاش
 اور مرغِ لبیل کی طرح تڑپ کو بیان کر کے ٹھٹھے مارنے اور بجائے
 ہمدردی اور دل سوزی کے دانت بھاڑ دینے

حادثہ: (عکرمہ سے) "تم سمیٹہ کو نہیں دیکھتے، جب اس پر تڑپا تڑا اور
 لگاتار کوڑے پڑتے ہیں تو کیسی کیسی تلملاتی ہے اور لبیل کی طرح
 لوٹ پوٹ ہو جاتی ہے۔ لیکن کمال ہے، منہ سے آف تک نہیں
 کرتی، نہ روئی دھوتی سے اور نہ واویلا کرتی ہے۔ تم نے غور نہیں کیا

ہم اپنے ہاتھوں کے اشاروں سے اسے ڈرا دیتے تھے، جدھر اشارہ کرتے اسی بل گرجاتی تھی پھر پڑا پڑا کوڑے پڑتے تو ایسی اکڑ کر زمین سے اٹھتی جیسے کسی نے کسی کو لوہے کے اسکرٹے سے زمین سے اٹھالیا ہے۔ وہ منظر قابل دید ہوتا تھا اور ہم ہنسی کے مارے لوٹ لوٹ ہو جاتے تھے، منستے منستے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے اور آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے، کتنا یہ لطف تھا وہ نظارہ!

حکمرانہ! مجھے تو سب سے زیادہ تعجب اس کے بوڑھے پھونس شوہر پر آ رہا ہے۔ ہم نے کوڑے مار مار کر اس کی بوٹیاں اڑا دیں اور جگہ جگہ سے اس کا جسم جلادیا کہ ہمارے دیوتاؤں کو برا بھلا نہ کہے، مگر میرے والد اپنے اس ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے جتنی اس کی سزائیں بڑھتی جاتیں اسی اندازے سے وہ ہمارے دیوتاؤں کی مذمت کرتا جاتا اور ان کا مذاق اڑاتا۔ عمار تو بالکل خاموش اور گم گم تھا، اس کا جسم مار کھاتے کھاتے بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ مگر اس وقت بھی اس کے ہونٹوں پر غضب کی مسکراہٹ تھی جو تلخ و شیریں دونوں پہلوؤں کے ہوئے تھی۔ خدا ہی جانے مسرت کی نشانی تھی یا غیظ و غضب کی مگر اس کی یہ انوکھی

مسکراہٹ اُس کے لبوں سے زیادہ میرے دل پر کندہ ہو گئی
میں اسے بھولتا ہی نہیں، شاید عمر بھر نہ بھولوں۔

صفوان بن امیہ: اگر تم بلال حبشی کو دیکھ لیتے تو ہنسی کے مارے
لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ چند نوجوان بلال کے ہاتھ پاؤں پکڑے ہوئے
اُسے اپنی اپنی طرف کھینچ رہے تھے، جیسے تکا بونی کر کے آپس میں
بانٹنا چاہ رہے ہوں۔ لیکن کمال ہے، ضبط ہو تو ایسا ہوسع

لبوں پر نہ شکوہ زباں پر نہ آہ

مجال ہے جو آفت تک بھی کی ہو، اُحد اُحد کی وہی ایک رٹ تھی جو
اُس کی زبان سے بے ساختہ نکلی چلی جا رہی تھی۔

حالد: مجھے تو صہیب پر تعجب ہے، بیچارہ آگ میں جلایا جا رہا تھا
اُس کا جسم نیزوں سے چھلنی کیا جا رہا تھا اور اوپر سے ٹڑا ٹڑ
کوڑے پڑ رہے تھے، لیکن پھر بھی وہ بہادر اس طرح ان سے باتیں
کرتا جاتا تھا، جیسے اُسے کسی بات کی پروا ہی نہیں۔ کبھی کبھی
جب مار شدت اختیار کر لیتی تو غریب کی زبان بند ہو جاتی،
پیشانی سے پسینہ بہنے لگتا اور پھر ذرا ہوش آتے ہی وہی بے فکری
کی باتیں کرنے لگتا۔ گویا کسی نے اُسے مارا ہی نہیں۔ جسم پر کوڑوں
کی بارش ہو رہی ہے، آگ میں جلایا جا رہا ہے، اور گرم سلاخوں سے

وانا جارہا ہے، لیکن کمال کا ضبط تھا، اور پھر بھی ہماری مخالفت کرتا رہا۔ ہم اُس کے جسم پر کوڑے برسارہے تھے اور وہ ہمارے دلوں کو داغتا جاتا تھا۔ جب مارتے مارتے لوگ تھک گئے، اور انتہائی مشتعل ہو کر سنگین ستراؤں پر اتر پڑے تو مار کھاتے کھاتے صہیب اُدھ مُوا ہو گیا اور اُس پر کچھ غفلت سی ظاہری ہو گئی، آخر کار بے ہوش ہو گیا، اور غفلت میں کچھ غلط باتیں منہ سے نکل گئیں، لوگ مارے خوشی کے اُچھل پڑے کہ ہمارا مقصد حل ہو گیا، فوراً نیرے، کوڑے، بوسے کی سلاخیں اور آگ اُس سے ہٹالی گئی۔ مجھے تو ان لوگوں کی بعض شرمناک حرکتیں بُری معلوم ہوئیں۔

حارث: ”چپ رہو خالد، کہیں تمہارا پچھل بھائی یہ بات نہ سُن لے ورنہ تمہیں بھی سزا دیئے بغیر نہ چھوڑے گا۔“

اس طرح قریشی نوجوان ان کمزور مسلمانوں کے صبر و ثبات، ضبط و تحمل، اور صبر و سکون پر بڑے متعجب تھے، اور یہ بے لیس ان کی تفریحِ طبع اور دل لگی کا سامانِ نشاط بن رہے تھے۔ ابھی مذاق اڑا رہے ہیں، ابھی اُن پر ٹھٹھا مار کر ہنس رہے ہیں، کبھی دل لگی کے طور پر مہرزدی و غمگساری کا اظہار کر رہے ہیں

اور کبھی مارنے والوں کی فتاحہ ذمت کر رہے ہیں۔

قریشی غلام اور حلیف جب بے گناہوں پر مظالم ٹوٹتے ہوئے
 دیکھتے تو چار و ناچار اپنے آقاؤں کی اسفین اطاعت کرنی پڑتی
 لیکن ان کے دل ان کے ساتھ نہ ہوتے، وہ جو رو ستم کو دیکھ کر
 گڑھے ضرور تھے، مگر بچا رہے اس کے خلاف کوئی قدم ہی نہ
 اٹھا سکتے تھے، اور دل ہی دل میں اسے برا سمجھتے تھے، گو زبان
 سے اچھا کہہ رہے ہوں۔ بہت سے لوگ تو بچہ خوف زدہ اور
 سہمے رہتے تھے۔ لیکن چند لوگ ایسے بھی تھے جو خوف سے
 بے پرواہ ہو کر آنے والے وقت کے منتظر تھے، وہ اپنے دل
 ہی دل میں کہتے اور موقع پا کر آپس میں ایک دوسرے سے
 کہتے کہ سچ پوچھو تو حق محمد صلعم کے ساتھ ہے۔ ہماری اسی میں
 خیر ہے کہ آپ کے ساتھ مل جائیں، کیونکہ چند دھاگے جب آپس
 میں مل جاتے ہیں تو مضبوط بن جاتے ہیں، قطرہ قطرہ دریا ہوتا
 ہے۔ ممکن ہے ایک دن ایسا بھی آجائے کہ حق تعالیٰ ان کا
 انتقام ان ظالموں سے مجرم کے اور ان کے ساتھیوں کے ذریعہ
 لے لے اور ان ستمگازوں سے نجات مل جائے۔
 وہ غریب و غربا جو قریش کی دسترس سے اب تک باہر تھے

اور قریشی انہیں ستاتے ہوئے گھبراتے تھے۔ ان مظلوم مسلمانوں کے لئے ان کی سلامتی کی دعائیں مانگتے تھے۔ انہیں پورا اطمینان تھا کہ حق تعالیٰ ضرور اپنا وعدہ پورا فرمائے گا اور ان بے چاروں کو ضرور ان ظالموں کے نتیجہ جو رواستبداد سے نجات ملے گی۔ انہیں یقین تھا کہ ان کا انجام بخیر ہوگا، انہیں بھروسہ تھا کہ حق تعالیٰ ضرور اپنا وعدہ پورا فرمائے گا۔ اور ان کے دن پھیرے گا۔ مگر پھر بھی اپنے بھائیوں پر جبر و ستم دیکھ کر ان کے دل بکڑھتے تھے اور ان کی حالت زار پر انہیں ترس آجاتا تھا، بلکہ کبھی کبھی تو یہ دعائیں مانگتے کہ کاش وہ چھوٹ جاتے اور ان کی جگہ ہم آجاتے اور خدا کی راہ میں ہر طرح کی قربانیاں پیش کرتے۔ اس روز شام کے وقت ہر مکی حیران و پریشان ہے اور فکر و غم میں مبتلا ہے، ایدائیس اور نکالیف دیکھتا ہے لیکن یہ نہیں بتا سکتا کہ درست ہے یا نادرست انہیں معلوم ہی نہ تھا کہ یہ سب خیر ہے یا شر، بھلائی ہے یا برائی توڑے بہت لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے حق تعالیٰ سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کر دکھایا۔ ان کے دل خوش تھے، اور نفس مطمئن۔ انہیں اس بات کا پورا یقین تھا کہ یارساؤں کا بہترین انجام ہوگا۔ اگر مکیوں کی آنکھوں سے پردہ اٹھا دیا جاتا تو

وہ آج کی رات مکہ کے گرد و نواح میں دیکھتے کہ شیاطین عیدیں منارہے ہیں۔ وہ باغ باغ ہیں اور خوشی کے شادیاں بجا رہے ہیں۔ اب ان کی یہ آرزو باقی ہے کہ محمد صلعم کے ماننے والوں کو سخت ترین عذاب میں دیکھ لیں۔ شیطان نے خدا کے پاس میں اور خود اپنے نفسوں کے بارے میں انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے، وہ یہ خیال کئے ہوئے ہیں کہ شاید اسی طرح اودھم مچا سے اور نبی کے ماننے والوں کو ستانے سے مکہ میں ان کا تسلط واقعہ باقی رہے گا اور قریشیوں کے دلوں میں ان کی قدر و منزلت بھی قائم رہے گی۔ صبح کو سرکار رسالت کی خدمت اقدس میں آپ کے ماننے والے حاضر ہوئے اور جور و استبداد کی ساری داستان اول سے آخر تک آپ کو سنائی۔ آپ نے انہیں فرید مظالم کے واقعات سنائے جو انہیں معلوم بھی نہ تھے مگر آپ ان سے خبردار تھے اس وجہ سے نہیں کہ آپ کے چشم دید واقعات تھے بلکہ اس لئے کہ وحی کے ذریعہ آپ کو ساری باتوں کی خبر کر دی گئی تھی۔ دن پڑھے آپ اور آپ کے رفقا روزی کی تلاش میں مکہ میں متفرق ہو گئے اور قبائل میں پھیل گئے۔ غالب خیال تو یہی ہے کہ مسلمانانِ ان منظوموں اور ستم رسیدہ لوگوں کو دلاسا دینے کے لئے نکلے ہوں گے۔

جو محض لایۃ اللہ کے اقرار کی وجہ سے ظلم و استبداد میں مبتلا تھے اور جنہیں توحید کی راہ سے ہٹانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا تھا۔ سرکار رسالت بھی بطحا مکہ کے کسی طرف نکل گئے آپ حضرت عثمان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے جا رہے تھے کہ آلِ یاسر کے پاس سے آپ کا گذر ہوتا ہے۔ ان بے گناہوں کو ہاتھ پاؤں باندھ کر چاروں خانے چت لٹا دیا گیا تھا اور ان کے سینوں پر بھاری بھاری بھلستی ہوئی چٹانیں رکھ دی گئی تھیں۔ غنڈے کبھی کبھی انہیں آگ سے جلا بھی دیتے تھے، اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد نیرے اور خنجروں سے ان کے جسم پھیدتے تھے۔ لیکن یہ تینوں ستم رسیدہ خاموش تھے اور زبان سے اُف تک بھی نہ کہتے تھے۔ اُس پر غنڈے اور بھی جل بھن کر کباب ہو جاتے تھے، کیونکہ انہیں کامیابی کی صورت نہیں دکھائی دیتی تھی، اور ان کے منہ سے ان کے مطلب کی بات نہیں نکل رہی تھی۔ ان کی لگاتار خاموشی نے انہیں جلا کر کوئلہ کر دیا تھا۔ آخر کار جل بھن کر وحشیانہ سزاؤں پر اتر آئے تھے۔ مگر پھر بھی منطوق خاموش تکالیف کا مقابلہ کر رہے تھے ان کے کوہ پیکر عزم کے سامنے ان غنڈوں کی تو بھلا کیا حقیقت تھی پہاڑ بھی ہوتا تو اپنی جگہ سے ہٹ جاتا۔ مگر ان

کے دل اس قدر مضبوط و مستحکم تھے کہ طاقت انسانیت سوز شرمناک
 سزائیں انہیں ہلا نہیں سکتی تھی۔ بے صبری آشکاوہ و شکایت اور آہ
 و بکا کا تو وہاں تک گزر ہی نہ تھا۔ جب سرکار رسالت اور آپ
 کے رفقاء وہاں سے گزر رہے تھے، تو اس وقت قریشی غنڈوں
 نے پہلی بار بوڑھے یاسر کی آواز سنی۔ یہ اللہ کا ولی مشرکوں سے
 خطاب نہیں کرتا بلکہ اللہ کے رسولؐ کے عرض کرتا ہے کہ اسے
 اللہ کے رسولؐ کیا زمانے کا یہی حال رہے گا۔ آپ فرماتے ہیں
 اے یاسر کے خاندان والے لوگو! خوش ہو جاؤ جنت تمہاری
 منتظر ہے۔ اس وقت قریشی غنڈوں نے بی بی سمیہ کی آواز بھی
 پہلی ہی بار سنی، وہ ان سے نہیں بلکہ اللہ کے رسولؐ سے عرض
 کر رہی تھیں، میں اقرار کرتی ہوں کہ آپ اللہ کے رسولؐ ہیں، اور
 اس بات کا بھی اقرار کرتی ہوں کہ خدا کا وعدہ سچا ہے۔ اسی وقت
 عمار بھی پہلی بار بولے، وہ اپنے والدین سے مخاطب نہیں
 بلکہ اللہ کے رسولؐ سے، بلکہ ان ستمگاروں اور پیشہ ور ظالموں سے
 مخاطب ہو کر عرض کرتے ہیں کہ بد معاشرہ! جتنا چاہو ظلم و ستم تو رو،
 ہم بہت آگے بڑھ گئے ہیں، جنت ہمارے انتظار میں ہے اور
 جہنم تمہاری تاک میں ہے۔ یہ سن کر غنڈے آپ سے باہر

ہو جاتے ہیں، مغلوب الغضب ہو کر بھٹا اٹھتے ہیں اور ان بیکسوں پر ایسے ایسے ستم توڑتے ہیں جن کی نہ ہم میں بیان کی قدرت ہے اور نہ قارئین کو پڑھنے کی طاقت۔

حضرت ابو بکرؓ بھی وادی بطناء کی ایک سمت میں نکل جاتے ہیں، وہاں یہی غنڈے بلالؓ پر ٹوٹے پڑے ہیں اور انہیں مشق ستم بنا رہے ہیں، انہیں آگ میں جلاتے ہیں، پانی میں ڈبواتے ہیں، گرم سلاخوں سے داغتے ہیں، تھراتھ کوڑے مار کر خون کرتے ہیں۔ بھلستے ہوئے ریت پر، گرم گرم سنگریلوں پر، اور دھکتے ہوئے انگاروں کے بستر پر انہیں لٹا دیتے ہیں۔ اور اوپر سے بھلستے ہوئے بھاری بھاری پتھر ان کے سینے پر رکھ دیتے ہیں، تاکہ وہ توحید کی امانت کھو بیٹھیں اور ان کے دیوتاؤں کو برا بھلا نہ کہیں۔ مگر یہ فرزند توحید احد احد کے سوا اور کچھ نہیں کہتا۔ یہ کم بخت احد سے بڑے پڑھتے تھے، اور یہ سمجھتے تھے کہ یہ گالی ہے جو ہمارے دیوتاؤں کو دی جا رہی ہے۔ "بلال! ہمارے دیوتاؤں کو گالیاں نہ دے، میں تیری سزا موقوف کرانے دیتا ہوں۔" اُمیہ تنگ آ کر کہنے لگا۔

"اُمیہ! میری زبان میرے قابو میں نہیں، کیا کروں زبان میرا

ساتھ نہیں دیتی۔ بلال نے جواب دیا اور پھر وہی آخدا آخدا کی
 رٹ لگانی شروع کر دی۔ آخر آیتہ اور اس کے نوکر چاکر تھک کر
 چور ہو جاتے ہیں اور عاجز آ کر نہرا میں موقوف کر دیتے ہیں۔ بلال
 کے سینے سے بھاری پتھر ہٹا دیا جاتا ہے اور انہیں سیدھا کھڑا
 کر کے رسیوں سے باندھ دیا جاتا ہے۔ دونوں بازوؤں اور رانوں
 میں چار لمبی لمبی رسیاں باندھ کر بچوں کے ہاتھوں میں پکڑا دی
 جاتی ہیں، اور ان سے کہہ دیا جاتا ہے کہ بھلستے ہو کے ریت پر
 گھسیٹتے ہو کے پھرتے رہو۔ بچے انہیں گھسیٹ کر کبھی ادھرتے ہیں
 اور کبھی ادھر لے جاتے ہیں۔ کبھی آگے کھینچتے ہیں اور کبھی پیچھے
 زور زور سے پھینچتے چلاتے اور سنتے بھی جاتے ہیں۔ آیتہ اور اس
 کے ساتھی یہ تماشا دیکھ کر ٹھٹھے مار رہے ہیں۔ مگر بلال کو پرواہ بھی
 نہیں، نہ مزاحمت کرتے ہیں نہ بچوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ بلکہ
 جدھر وہ کھنچتے ہیں کھینچے چلے جاتے ہیں۔ زبان سے برابر آخدا آخدا
 نکل رہا ہے جس سے یہ غنڈے روحانی غدا ب میں مبتلا ہیں۔ جب
 بچے تھک کر چور ہو جاتے ہیں، ہانپنے لگتے ہیں اور ان کے ہاتھوں
 کی طاقت سلب ہو جاتی ہے۔ اور ہاتھ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں تو رسیاں
 پھینک پھانک چل دیتے ہیں۔ لیکن اس وارفتہ توجید کی وہی

ایک صدائے 'آخِ اَحَدِ اَحَدِ اَحَدِ' یہ گالی سن کر اُمیہ اور اُس کے نوکر چاکر بھناٹھتے ہیں اور کچھ غنڈے آگے بڑھ کر بلال رضی کے سینے میں ایک ایسا زور کا مٹکا مارتے ہیں جس سے وہ زمین پر ایک خوفناک دھماکے سے چاروں خانے چت کر پڑتے ہیں۔ لیکن اس وقت بھی اس عاشق توحید کی زبان پر اَحَدِ اَحَدِ اَحَدِ کی صدا ہے۔ اس فقیر کی یہ صدا اُمیہ کے گولی بن کر لگتی تھی۔ آخر اُمیہ غصے سے بے قابو ہو کر ان کی طرف جھپٹنا چاہ رہا ہے کہ اسلام کا ایک مجاہد اور مخلص سپاہی اُمیہ کے سامنے آ جاتا ہے، ابو بکرؓ اُمیہ! ایک بے کس کو ستانا کس قدر شرمناک اور ذلیل حرکت ہے، آخر اس بیچارے کو کیوں تکلیف دے رہے ہو؟ اُمیہ: "ابن ابی قحافہ! تمہیں اس سے کیا، ہمارا غلام ہے، ہمیں اختیار ہے جو چاہے کریں، تم کون بولنے والے۔" ابو بکرؓ اُمیہ تم بھول گئے تم سے پہلے یہ مظلوم خدا کا بندہ اور غلام ہے، ذرا عقل سے کام لو۔ اگر تم نے اس کی جان لے لی تو ایک بڑے گناہ کے ارتکاب کے علاوہ اپنا مال بھی برباد کر بیٹھو گے، میرے بہترین مشورے پر غور کرو۔" اُمیہ: "فرمائیے، کیا مشورہ ہے؟"

ابوبکرؓ۔ یہ غلام مجھے دسے دو، اور منہ مانگی قیمت لو، بولو کیا مانگتے ہو؟
 چونکہ امیہ بلال سے انتہائی تنگ آچکا تھا اور سخت بنہرار اور
 متنفر تھا اس لئے اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور کہنے لگا۔
 امیہ: مجھے منظور ہے، میں نے اسے تمہیں بیچ دیا، (۲۸۰) درہم
 عنایت فرما دیجئے۔“

ابوبکرؓ: اچھا اپنی پوری رقم لو بلال کو چھوڑ دو، اور میرے ساتھ
 ساتھ آؤ، گھر جا کر تمہاری رقم ادا کر دوں گا۔“
 امیہ: ”نہیں نہیں، پہلے پیسے ادا کرو تب بات کرنا۔“
 ابوبکرؓ: امیہ! بڑی افسوسناک بات ہے، یہ تم کیا کہہ رہے ہو
 کیا تم مجھے نادہند سمجھتے ہو؟“

امیہ: ”شرمندہ ہو کر“ اچھالے جاؤ، جب مرضی آئے پیسے بھیج دینا
 ابوبکرؓ: ”میں گھر جاتے ہی تمہارے پیسے بھیج دوں گا۔“
 ابوبکر بلال کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے آئے۔ انھیں تسکین و
 تسفی دی، ان کا غم غلط کیا اور انھیں امیہ کے روح فرسا دظالم سے
 چھڑا کر آرام و راحت پہنچایا، دیر تک ان سے باتیں کرتے رہے،
 جب ان کے قاصد نے ان سے آکر یہ کہہ دیا کہ امیہ نے اپنی رقم
 وصول کر کے رسید دے دی ہے، تو بلال سے مسکرا کر فرمانے لگے

”بلال میں نے خدا کی رضا مندی کے لئے تمہیں آزاد کر دیا۔ اب تم جہاں چاہو جا سکتے ہو۔“ جب حضرت ابو بکر شام کو رحمتہ للعالمین سے ملے تو آپ سے بلال کے دل ہلادینے والے مصائب کا تذکرہ کرنے لگے، اور کہنے لگے کہ اس کا حال زار دیکھ کر میرا دل دکھ گیا۔ میں نے انہیں امیہ سے چھڑانے کی بجز خرید لینے کے اور کوئی صورت نہیں دیکھی، آخر کار میں نے انہیں خرید لیا۔“

رسول اللہ صلعم: ”اس سودے میں مجھے بھی شریک کر لو۔“

ابو بکر: ”یا رسول اللہ میں تو انہیں آزاد کر چکا.....“

کچھ مسلمان ایک اور سمت کو نکل گئے۔ وہاں انہوں نے بڑا دردناک منظر دیکھا کہ ایک گڑھے میں جو کافی لمبا چوڑا ہے، آگ دہکائی جا رہی ہے، اور ایک شخص کو جس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں لوگ اٹھا کر آگ کے پاس لے جاتے ہیں، جیسے ہی آگ اس کو اپنی لپیٹ میں لینا چاہتی ہے فوراً اسے الگ کر لیتے ہیں، اور آگ سے دور لاکر مشکیں کس کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ پھر ایک کم نخت خندہ سامنے سے آکر اس کے سینے میں زور سے لات مارتا ہے وہ شخص لات کھا کر دھڑام سے زمین پر گر جاتا ہے۔ لوگ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ بار بار اس غریب کے ساتھ

یہی شرمناک اور ذلیل حرکت کی جا رہی ہے۔ پھر ایک شخص اُس کے پاس آ کر کہتا ہے، دیکھ اب بھی باز آ جا، ہمارے دیوتاؤں کو یہ نہ کہہ بلکہ محمد کو اور اُس کے دین کو برا کہہ دو۔ یہ آگ بجھے کھا جائیگی اور یہ زمین تجھے پٹھنیاں دے دے کر ختم کر دے گی۔ لیکن اس مخلص کی زبان سے یہی کلمے سنتے ہیں :-

أَشْهَدُ أَنْ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللَّهِ أَرْسَلَهُ

بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ

میں اقرار کرتا ہوں کہ محمد صلعم اللہ کے رسول ہیں جنہیں حق تعالیٰ نے ہدیت

اور سچا دین دے کر بھیجا ہے

لوگ اُسے بدستور آگ میں جلاتے اور نکالتے رہے، پھر کھڑا کرتے اور زمین پر پٹختے رہے۔ ایک دفعہ جو زمین پر دھرام سے گراتے تو بیچارے ہوش ہو گیا۔ اُس کی مردہ حالت دیکھ کر لوگ آپس میں کہنے لگے، قریشیو! رحم کرو، اس غریب کی جان نہ لو، ورنہ بخا زمرہ تمہاری جان کو آجائیں گے اور تمہیں ناک چنے چبوا دیں گے۔ صحابہ کرام یہ دردناک اور روئے بنگٹے کھڑا کر دینے والا آنکھوں دیکھا منظر اپنے اجباب و اقارب کو سنا رہے ہیں۔ اور جناب بن ارت کی بیٹا پر تبادلہ خیالات کر رہے ہیں۔ قریشی ان بے گناہوں پر نہ

صرف مہینوں بلکہ برسوں پہی ستم ڈھاتے رہے۔ لیکن ان کی اُمیدیں
 دل ہی دل میں رہ گئیں، جس لئے یہ مظالم توڑے جا رہے ہیں
 وہ امید تو بر آتی نظر نہیں آتی۔ جب توحید کا نور کسی دل پر چھا
 جاتا ہے تو اُس کی جان چلی جاتی ہے، مگر ان بان نہیں جاتی
 کہ بختِ غنڈے ان کا دین ذرا بھی نہ بگاڑ سکے۔ البتہ جس کو خدا
 کے عذاب ہی نے گھیر لیا ہو تو وہ اسلام لاکر مظالم سے گھبرا کر
 مرتد ہو جاتا ہے، مگر ایسا واقعہ مشکل ہی سے نظر آتا ہے۔ عام
 طور پر یہی ہوتا ہے کہ کچھ اللہ کے مقرب بندے اپنے دین
 میں آزوائے جاتے ہیں، اور وہ اس آزمائش میں پورے اترتے
 ہیں۔ اس راہ میں اگر ان کی جان بھی چلی جاتی ہے تو خدا کی
 بارگاہ میں انھیں عزت والا مقام اور بلند درجہ عطا ہوتا ہے۔۔۔
 ایک دن دوپہر کو قریشیوں کا ایک اہم کام کے سلسلے میں
 اجتماع ہوا، ابو جہل نے اس اجتماع میں بڑے فخر سے اعلان کیا کہ
 وہ یاسر اور آل یاسر سے اپنی نشا کے مطابق ہر بات کہانے
 میں کامیاب ہو گیا ہے۔ ابو جہل کہتا ہے، میں نے انھیں اتنا
 مارا پیٹا کہ تم مردہ بنا دیا، اور موت کے کنارے لاکر کھڑا کر دیا،
 اور اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک اپنے دیوتاؤں کی ان

سے تعریف و توصیف نہ کرا لی اور محمد کو اور اسلام کو برا بھلا

نہ کہلوا لیا۔

عنبہ: ابو الحکم! تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی، یا سر تو
 برا سخت اور کوہ پیکر غم والا ہے میرے خیال میں تو وہ
 جان دیدے گا مگر اپنے ایمان کی شان برقرار رکھے گا۔ تمہارے
 قبضے میں اس کا جسم ہے اس کا دل اور ضمیر نہیں۔

ابو جہل: اور اگر بجائے جان دینے کے اس نے اپنا عہد
 و پیمان ٹوڑ ڈالا تو؟ اگر کہو تو تمہارے سامنے اس سے محمد کو اور
 اسلام کو برا کہلوا دو!

عنبہ: ابو الحکم! چھوڑو ان باتوں کو مجھے خوب معلوم ہے، وہ
 اپنا عہد و پیمان ٹوڑنے والا نہیں، یہ تمہارا حسن ظن ہے، میں
 اس کی عادت سے خوب واقف ہوں۔ میرے خیال میں تم نے
 اس بیچارے کی جان لینے کا ارادہ کر لیا ہے۔

ابو جہل: اگر اس نے ہمارے دیوتاؤں کو برحق اور محمد کو
 جھوٹا کہہ دیا ہو تو؟

عنبہ: تو کیا ہے چلو شرط بدلو، بیس اونٹ دوں گا!
 عنبہ: اور بیس میں دوں گا!

ابو جہل: تم لوگوں کا مال ارزاں معلوم ہوتا ہے، آج تو خوب
 سخاوت پر اتر آئے ہو۔
 عتبہ: اگر تم نے یا سر کی جان لے لی تو؟
 شیبہ: اور تم اس سے محمد کے خلاف نہ کہلوا سکے تو؟
 ابو جہل: تو پھر تم لوگ جو فیصلہ کرو مجھے منظور ہے!
 عتبہ: بھئی ہم فیصلہ و بصلہ تو کرتے نہیں، ہم تمہیں نقصان
 پہونچانا نہیں چاہتے، تمہیں کیا یہ روحانی اذیت تھوڑی ہے
 کہ تم اپنی ناکامی پر کھڑے رہو؟
 آخر کار یہ تینوں اس جگہ پہونچ گئے جہاں یا سر کو اور آل
 یا سر کو جو ردا استبداد کا شکار بنایا جا رہا تھا۔
 قریشیوں نے حرم میں کبھی کسی پر اتنا ظلم و ستم نہ توڑا تھا،
 جیسا کہ اس روز توڑا۔ لیکن مظلوموں سے اپنی مرضی کے مطابق
 ایک نفظ نہ نکلا سکے۔ جب یہ تینوں سردار ان بیکسوں کے
 پاس پہونچے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک طرف تو چڑے کی بڑی
 بڑی قد آدم ٹیکیاں پانی سے بھری ہوئی رکھی ہیں اور دوسری
 طرف آگ میں سلاخیں تپائی جا رہی ہیں اور ایک طرف ایک
 خاندان کے یہ تینوں افراد ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے پڑے ہیں

جیسے کوئی لاوارثی چیز گر گئی ہو۔ ابو جہل کے حکم سے یہ تینوں
 افراد اٹھائے گئے اور اُس کے سامنے لاکر زمین پر بیٹھ دئے گئے
 اب بھی ان ستم زدہ لوگوں کی زبانیں اللہ کے ذکر سے تر تھیں۔
 ابو جہل جل جہنم کہہ کباب ہو جاتا ہے، اور طیش میں آکر ان
 تینوں بے کسوں پر تڑا تڑ کوڑے برسائے شروع کر دیتا ہے۔ پھر
 آگ سے جلاتا ہے اور اوپر سے پانی کی مشکیں چھڑوا دیتا ہے
 پہلے تو بار بار یہی عذاب کرتا رہا پھر انہیں پانی سے بھری ہوئی
 چمڑے کی ٹٹکیوں میں غوطے دیئے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان
 کا سانس گھٹنے لگتا ہے، پھر انہیں باہر نکال لیا جاتا ہے، اور
 سانس ٹھیک ہونے تک انتظار کیا جاتا ہے۔ جب ان کا سانس
 ٹھیک ہوتا ہے تو اُسے پھر وہی اللہ اللہ، محمد رسول اللہ کی
 صدائیں سنائی دیتی ہیں۔ ابو جہل آگ بگولا ہو کر چھپتا ہے اور
 نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بد اخلاقی سے گفتگو کرتا ہے اور کہتا ہے:
 ابو جہل، تم بخت اگر اب بھی تو ہمارے دیوتاؤں کو اچھا اور محمد کو
 بُرا نہ کہے گی تو یو نہی سسک سسک کر دم توڑ دے گی، اور ہمیں
 تڑپ تڑپ کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گی۔ آج اگر تو نے
 میری بات نہ مانی تو تجھے شام دیکھنی نصیب نہ ہوگی۔

سمیہ :- (بڑے اطمینان سے اور رُکی رُکی آواز میں) لعنت ہے
 تجھ پر کم بخت اور تیرے جھوٹے خداؤں پر، زیادہ سے زیادہ تو
 میری جان لے لیگا۔ اب مجھے تیری منحوس صورت دیکھنی گوارا نہیں،
 مجھے موت سے زیادہ کوئی خیر پیاری نہیں۔"

سمیہ کے یہ کلمے سن کر عتبہ اور شیبہ منسی کے مارے لوٹ
 پوٹ ہو جاتے ہیں اور ابو جہل غصے سے تمنا کر بُرا بھلا کہتا ہوا
 ان کے پیٹ پر اندھا دھند لائیں مارنے لگتا ہے۔ لیکن اب بھی
 سمیہ اپنی رُکی رُکی سی آواز میں برابر یہی کہے جا رہی تھیں :-
 "فارت ہو تو اور تیرے جھوٹے خدا۔" ابو جہل کا اور بھی
 تھرمیٹر تیز ہوا، اور کم بخت نے مغلوب الغضب ہو کر بے سوچے
 سمجھے انھیں نیرے میں بندھ لیا۔ غصہ سے پاگل تو ہو ہی چکا تھا
 یہ بھی خبر نہ رہی کہ اس طرح سمیہ سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ نیرہ
 لگتے ہی دھیمی آواز میں لا الہ الا اللہ پڑھتی ہوئی دنیا سے
 سدھار گئیں۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون، اسلام میں شہادت کی
 پہلی سعادت اس نیک خاتون کے حصہ میں آئی۔
 "ناس جلے تیرا اور تیرے دیوتاؤں کا خبیث تو نے اس
 کی جان لے لی۔" یا سمر کی زبان سے بے ساختہ چیخ نکلی۔"

دو مکینے تیرا اور تیرے خداؤں کا ستیا ناس ہوا تو نے اسے
جان سے مار دیا، اب جل بھن کر کباب بن جا، وہ تو جنت کو
سدھار گئیں، تیرے اوپر جہنم بھڑک رہی ہے۔ عمار نے غصے
میں بھر کر کہا:

"بلاشبہ خدا کا وعدہ سچا ہے۔" یاسر نے جواب دیا وہ کچھ اور
کہنا چاہتے تھے مگر ابو جہل نے انھیں مہلت ہی نہ دی، اور
ان کے پیٹ پر بھی اس زور سے لات ماری کہ اس کی تاب نہ
لا کر یاسر بھی راہی ملک بقا ہوئے اور اپنی رفیقہ حیات کے
نقش قدم پر چلتے چلتے جنت الفردوس میں ان سے جا ملے۔
انما یلذوا انالیہ راجعون

عتبہ اور شیبہ نے ابو جہل سے کہا، تمہیں یاد ہو گا تم نے
ہم سے کہا تھا کہ اگر میں سمیہ اور یاسر سے محمد کے خلاف کہلوانے
میں کامیاب نہ ہوا تو پھر تم جو چاہو فیصلہ کرنا۔ ابو جہل خاموش
اور دم سادھے رہا، مگر دوسرے قریشی سرداروں نے کہا: بیشک
بیشک، ہمارے سامنے کہا تھا، ہم گواہ ہیں۔ اچھا اب میرا یہ فیصلہ
ہے کہ جو کچھ ہوا سوا ہوا، اس پر تو خاک ڈالو اور عمار کو آنا د کر کے
چھوڑ دو تاکہ یہ غریب اپنے ماں باپ کی بھیر و تکفین میں مصروف ہو جا

اور انہیں سپرد خاک کر دئے۔ آج شام کو ابو جہل غصّہ میں لال بھبھو کا شکستہ
دل اور زنجور ہو کر گھر لوٹا۔ معاوم نہیں غصّے کا سبب کیا ہے۔ یا تو وہ
اس لئے بچیدہ ہے کہ اسلام کے دو مجاہدوں نے مردانہ وار اسلام کے
لئے اپنی جانیں دیدیں۔ اور یہ کم بخت ہاتھ ہی ملتا رہ گیا، یا ان کے صبر و
ثبات، ضبط و تحمل اور حسن ایشا رسے وہ چراغ پاسے اور اپنی ناکامی اور
جزولی کا سدھ ہے۔ کیونکہ ان دو جوان مردوں کی شہادت اسلام کے
اقتدار کو پکار رہی ہے۔ اور شب سیاہ کے پردوں سے نور سحر کی جھلکیاں
نمودار ہو رہی ہیں۔ اس بات سے اسلام کا غلبہ ظاہر ہے۔ آپ کے ساتھی
ہر طرح کی قربانیاں دے رہے ہیں، اسلام کی لاج رکھنے کے لئے شہادوں
سے فائز المرام ہو رہے ہیں۔ اور قریش کے غریب غریبا، شرفاء اور حلیف
آپ کے پاس دوڑ دوڑ کر جا رہے ہیں اور مشرف یہ اسلام ہو رہے
ہیں۔ گوہت سے مسلمان اپنے ایمانوں کو چھپائے ہوئے ہیں مگر ایمان
کی دولت سے تو مالا مال ہو رہی ہے۔ یہ اسلام کی برکتیں نہیں تو اور
کیا ہے کہ جو غلام اور حلیف سرداروں کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں بول
سکتے تھے اب ان کی بغاوت پر اتر آئے ہیں اور ان کی سرداری کو
تسلیم کرنے کے لئے ایک منٹ کے لئے بھی تیار نہیں۔ اگر قریشی سردار
ان غلاموں کو ڈالتے ڈپٹتے اور سزائیں دیتے بھی ہیں تو وہ ان سے

مرعوب نہیں ہوتے نہ بھاگ کر جان چھپاتا چاہتے ہیں بلکہ ان کا مقنا
 کرنے کے لئے تیار ہیں، ان سے ذرا نہیں دہتے، ان کا قطعی کہنا نہیں بلکہ
 ہر طرح کی آفت و مصیبت کے لئے سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اور
 ہنس ہنس کر ان کے اقتدار کو خاک میں ملا دیتے ہیں۔ اگر یہ ہنس
 شعاروں کے دل کباب بنا دیتی ہے۔ یہ ذہنی انقلاب، یہ خیالات
 تبدیلی، یہ اسلامی رجحانات اور یہ باطل کے محاذ کا ڈٹ کر مقابلہ کس
 نے سکھایا، یہ اسلام ہی کے توفیوض و برکات اور رحمۃ للعالمین ہی
 پھیلائے ہوئے اثرات ہیں جن سے قریشی گھرانے ہوتے ہیں، یا اس
 لال بھوکا ہو رہا ہے کہ آخر محمد بھی تو ظلم و ستم کی داستانیں اپنے کانوں
 سے سنتے ہیں، آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور اچھی طرح جانتے بوجھتے ہیں
 قریشیوں سے ذرا مرعوب نہیں ہوتے، ان کے مظالم کا ذرا اثر نہیں لیتے اور
 کمال اطمینان و تسلی سے اپنے مذہب کی تبلیغ میں اور اس کی نشر و اشاعت
 میں لگے ہوئے ہیں، انہیں ترک تبلیغ کا خیال بھی نہیں آتا، پھر اپنے رفقاء
 کے ساتھ واقعات و حالات معلوم کرنے کے لئے نکلتے ہیں اور اپنے
 ماننے والوں کو جو ر و ستم کا شکار دیکھ کر انہیں شفقت بھرے لہجے میں تسکین
 و تسفی دیتے ہیں، اور ایک ایسی بات کہہ جاتے ہیں جہیں مسلمان اپنے
 دلوں میں گمراہ باندھ کر رکھ لیتے ہیں اور ہنس ہنس کر ہر قسم کی تکالیف

مصائب کو برداشت کر لیتے ہیں یہاں تک کہ اپنی جائیں بھی ان کے
 قدموں پر چھڑک دیتے ہیں۔ یہ قریش کے ساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہے
 کیا ان کی عزت و آبرو سے نہیں کھیلا جا رہا، اور ان کے اقتدار کو
 ملیا میٹ نہیں کیا جا رہا، قریش کی اس سے بڑھ کر اور کیا توہین ہوگی
 کہ ان کا اثر و اقتدار کینوں اور پست طبقے کے لوگوں کے دلوں سے
 اٹھا دیا جائے۔ اور سرداروں کے وقار کو خاک میں ملا دیا جائے۔ جب
 مکہ کے گرد و نواح کے عرب یہ سنیں گے کہ قریش کے پہلو میں ایک کانٹا
 چبھا ہوا ہے جس نے انھیں تنگ کر رکھا ہے اور کسی صورت سے نکلنے
 ہی نہیں پاتا۔ اس کے نکالنے کی ہر کوشش بے سود ثابت ہوتی ہے۔ جتنا
 جتنا وہ کرایا جاتا ہے اتنا ہی اور بڑھیں پکڑتا جاتا ہے اور اپنے اس
 پاس اور طرح طرح کے کلٹے بوریوں سے جو اگرچہ اتنے مضبوط نکیلے
 اور دھاردار نہیں مگر پھر بھی اذیت و تکلیف میں اس سے کم نہیں
 ان کانٹوں کی وجہ سے قریش کا تمام جسم خونم خون ہو رہا ہے، اور
 زخموں کے اندمال کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ تو وہ کیا خیال کریں گے
 یا اس فکر نے ابو جہل کو چراغ پائیا کہ اس کی پکڑ دھکڑ اس کی تلے
 دے اور اس کی سختی قریشی سرداروں کی نگاہ میں بے سود ہے۔ اس
 سے نہ انھیں کوئی ذالی فائدہ ہے اور نہ دیوتاؤں کو، بلکہ یہ سختی ناکردہ

گناہوں کے خون پیرا کر ختم ہو جاتی ہے جسے قریش اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے
 بلکہ اس کا یہ خطرناک اثر ہوتا ہے کہ مسلمان اور بھی مضبوط اور پختہ ہو جاتے
 ہیں یا اس بات سے وہ مشتعل ہے کہ عتیبہ اور شیبہ نے بازی حیت لی
 اور یہ کم محبت ہا رک گیا۔ وہ اپنے حسن تدبیر اور دور اندیشی پر باغ باغ ہیں
 اور اس کی تماشہ ہوشیاری کا مذاق اڑا رہے ہیں جس کا نتیجہ ابو جہل
 کے بارے میں اچھا نہ نکلے گا ہو سکتا ہے کہ اس کی سرداری ختم ہو جائے
 کیونکہ عتیبہ اور شیبہ عوام کے کانوں کو، دلوں کو اور ان کی محبت کو
 ختم کر سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بااثر لوگوں کو ایسا گرویدہ بنا لیں۔ اور قریش
 کی قیادت سنبھال لیں۔ یا ان تمام باتوں کو سوچ کر ابو جہل نے تاؤ کھایا
 خدا ہی جانتے کس چیز نے اسے طیش دلایا مگر اتنا ضرور ہے کہ وہ
 سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا گھر پوچھا، بظاہر تو اس کا چہرہ غصے سے
 تمٹتا رہا تھا لیکن اس کے دل پر نا امیدی اور یاس چھا رہی تھی اور دل
 ٹھکستہ اور پریشان خاطر نظر آ رہا تھا۔ اس کے مزاج سے برہمی اور تیز
 سے غیظ و غضب ٹپک رہا تھا، مزاج میں پڑ پڑا پن تھا گھر میں اس سے
 بات کرنے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی اس نے کھانا بھی نہیں کھایا اور نہ
 کسی سے بات کی بلکہ چپ چاپ غم سے نڈھال بستر پر جا پڑا اور ساری
 رات کرب و بے چینی اور قلق و اضطراب میں بسر کر دی۔ آج اس کی عیند

بھی اڑ گئی تھی اور ایک فکر و حشت اس پر سوار تھا جس نے آسے آگ
 کے بستر پر لٹا رکھا تھا۔ زخمی عمار کو لوگ اٹھا کر اس کے گھر لے گئے اور
 ان کے ماں باپ کی لاشوں کو بھی گھر پہنچا دیا گیا۔ اس وقت عام
 طور پر عمار کے ساتھ قریش کی ہمدردیاں تھیں، مسلم غیر مسلم سب ہی
 ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے، اس وقت شاید باہمی عداوت کو بھول گئے
 تھے یا اسے زبردستی بھلا دیا گیا تھا۔ اب تو سب کو یہی فکر تھی کہ عمار کو دلاسا
 دینا اور دو لاشوں کو سپرد خاک کرنا انسانی قرض ہے۔ چنانچہ وہ عمار
 کو تشکین و دلاسا دینے لگے اور ان کے ساتھ ہمدردیوں کا اظہار کرنے
 لگے۔ حالانکہ عمار کے سر سے پانی اتر گیا تھا۔ اب اس تکس کو ہمدردی
 کی کیا ضرورت تھی، خیر، جب عمار اپنے ماں باپ کو سپرد خاک کر آئے
 اور مشرک ان سے اجازت لے کر اپنے اپنے گھر پہنچ گئے تو مسلمانوں
 نے چاروں طرف سے عمار کو گھیر لیا۔ اس وقت عمار کی عجب نازک حالت
 تھی جسم پر جگہ جگہ زخموں کی سوزش اور جلن تھی، دل ایمان و یقین سے
 لبریز تھا اور طبیعت پر ماں باپ کی جدائی کا انتہائی بار غم تھا۔ عمار اپنے
 والدین کا صدمہ نہ کر وہ اپنی زندگی کے دن پورے کر کے رخصت ہو گئے
 تم سے پہلے ہی فردوس کے پر بہار باغوں میں جا پھڑے اور خدا کی رضا
 حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہمیں یاد ہو گا کہ ایک دفعہ اللہ کے رسول

تمہارے لئے جنت کا وعدہ فرما رہے تھے اور آپ نے ایک بار تمہیں بھی
 صبر کی تلقین کی تھی اور یہ دعا فرمائی تھی کہ اے اللہ! یا سر کو بخش دے
 لہذا اب صبر کرو اور خدا کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کرو۔ حضرت عثمان
 نے فرمایا بے شک ٹھیک ہے، ابو عمرو آپ کا فرمان سر اور آنکھوں پر، مجھے
 صدمہ کرنا نہیں چاہیے بلکہ خوش ہو جانا چاہیے کہ وہ جنت و رضا کی طرف
 مجھ سے سبقت کر گئے۔ ان سے اللہ کے رسول نے جنت کا وعدہ فرمایا
 تھا اور اللہ کا وعدہ سچا ہوتا ہے۔ عمار نے صبر و متانت سے جواب دیا۔
 ”تمہیں یاد ہو گا اللہ کے رسول نے تم سے بھی جنت کا وعدہ فرمایا تھا۔“
 عثمان نے کہا: ”افسوس اور ہزار افسوس، اگر میں بھی ان کے ساتھ ہی
 مرجاتا تو مجھے بھی خوشی بجالانے کا حق تھا افسوس وہ دونوں مجھے چھوڑ کر
 سدھار گئے زندگی قتلوں کی آماجگاہ ہے۔ میرا دل کمزور ہے مجھے اس
 چیز کا انتہائی غم ہے کہ موت کے خوش نیچے نے انھیں مجھ سے جدا کر دیا اور میں
 لوگوں کا تختہ مشق بننے کے لئے رہ گیا۔ لوگ مجھے گناہوں اور برے کاموں
 پر آمادہ کریں گے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میں میرے نیک عمل اور میری برکتوں
 قربانیاں رائیگاں نہ چلی جائیں۔ اور برائیاں میرے سر نہ منڈھ جائیں۔“
 عمار نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔
 عثمان نے دلائل دیتے ہوئے کہا: ”عمار! خدا کی رحمت سے ناامید

ت ہو، اس کے فضل و کرم سے اس مت توڑو اور اس کی مغفرت کے
 میدان رہو۔ تمہیں اپنے گناہوں کا تو خیال ہے مگر تم نے نیکیوں کی طرف
 غور نہیں کیا۔ اگر ایک طرف تمہیں گناہوں کا کھٹکا لگا ہوا ہے تو دوسری
 طرف نیکیوں کی بشارت بھی تو سامنے موجود ہے۔ تمہیں اس زندگی سے
 تیار نہ ہونا چاہیے، بلکہ اس کی آرزو کرنی چاہیے۔ کیونکہ اللہ کے رسول
 صلعم بھی تو ہم میں موجود ہیں۔“

”آپ کی بات بجا ہے“ عمار نے سنہل کر جواب دیا پھر وہ اس قدر
 تیزی سے اٹھ بیٹھے۔ گویا انہیں کوئی تکلیف یا اذیت یاد رکھنے ہی نہیں
 گویا ان کی پوری طاقت واپس آگئی ہے۔ اٹھتے اٹھتے عثمان اور دیگر
 ساتھیوں سے عرض کرنے لگے۔ ارے! یہاں کیوں بیٹھے ہوئے ہو
 سرکار رسالت کی خدمت گرامی میں کیوں نہیں چلتے۔ آخر کار سب
 حضرات وہاں سے اٹھ کر ارجم کے گھر اللہ کے رسول کی خدمت اقدس
 میں پہنچتے ہیں اور احادیث سننے کے لئے دوڑاؤ آپ کے سامنے
 بیٹھ جاتے ہیں۔ آپ انہیں نیند و موغظت سے مخلوط زمانے لگے
 دلوں کو پاک کرنے لگے، اور قرآن حکیم کی آیتیں پڑھ کر سنانے لگے
 ابو جہل، (عتبہ اور شیبہ سے) تم نے عمار کو موت کے پنجے سے
 چھڑا لیا ورنہ زمین میں دو کے بجائے تین مدفن ہوتے۔“

عقبہ: "ابو حکم! ہم نے تو آپ کا بوجھ ہلکا ہی کر دیا۔"
 ابو جہل: (ناپاک اور گندے ارادے سے مسکرا کر) "اگر مجھ سے
 پوچھو تو میں بھی دشمن کی موت کو پسند نہیں کرتا، کیونکہ موت عذاب
 سے چھڑا دیتی ہے اور دل کی بھڑاس نکالتے نہیں دیتی۔ مجھے تو یہ
 بات پسند ہے کہ وہ زندہ رہے اور طرح طرح کے عذاب دے کر دل
 کی بھڑاس نکالی جائے، اور اسے ہر دم نیا عذاب چکھا کر دل کی پیاس
 بجھائی جاسکے۔ اسے تکالیف و مصائب کے تلخ گھونٹ پلا کر اور
 خون کے آنسو لار لار کر دل کو ٹھنڈک نصیب ہوتی ہے۔ دیکھو میں
 تمہیں لات و غزی کی قسم دے کر کہہ رہا ہوں کہ آج سے تم میرے اور
 عمار کے بیچ میں نہ پڑنا ورنہ جنگ چھڑ جائے گی۔ کیا تمہیں معلوم
 نہیں کہ یا سہرا حلیف تھا، سمیہ ہماری لونڈی تھی اور عمار اب
 بھی ہمارا غلام ہے۔"

شعیبہ: "اچھا... تمہارے چچا ابو حذیفہ نے تو عمار کو اور اس کے
 دونوں بھائیوں کو آزاد کر دیا تھا۔"

ابو جہل: "تسلیم ہے لیکن حق و لا، تو ہمارا ہی ہے۔"

شعیبہ: "دڑھیل ہو کر" اچھا یہ بات ہے، حق و لا پر تم کو درمے ہو،
 ابو جہل کے دل میں نہ معلوم کیا کیا بہ ارادے پوشیدہ تھے، حق تعالیٰ

نے بھی عمار کے لئے نہ معام کیا کیا مراتب و درجات پوشیدہ رکھ
 چھوڑے تھے۔ عمار جب تک مکہ میں رہے ابو جہل کی اینداول کا برابر شکر
 رہے کم نجت نئے نئے ستم ایجاد کرتا عجیب عجیب سزائیں تراشتا اور تازہ تازہ
 انداز جو رو استبداد گھڑتا رہا اس کے مظالم کی داستائیں عوام کی زبان زد
 ہو چکی تھیں۔ اس ستم ایجاد نے ستم کا یہ نیا انداز نکالا کہ عمار کی زندگی اور آواز
 کو برقرار رکھا جائے اور انھیں جیل میں نہ بٹرایا جائے بلکہ سزائیں چکھاتا رہے
 تاکہ مسلمان مبتلیں اور آباؤی دین کے خلاف جسارت نہ کریں۔ چنانچہ جب
 ضرورت محسوس کرتا انھیں طرح طرح سے ستاتا اور جب جی چاہتا انھیں نختہ مشق
 بناتا۔ اب اس شیطان نے قسم کھالی تھی کہ وہ عمار کو ایسے ایسے مصائب سے
 دوچار کرے گا جو اپنی طرز کے بالکل نرے ہوں گے۔ ان سے وہ بات کہلو اگر
 چھوڑے گا جو ان کے ماں باپ سے نہ کہلو اسکا تھا اور انھیں کسی نہ کسی صورت
 سے اس بات پر مجبور کرے گا کہ وہ قریشی خداؤں کو اچھا اور محمد کو بُرا کہیں یہ مہم
 سر کرنے کے لئے نہ صرف شیطانوں نے بلکہ قریش کے نادانوں اور سر
 پھروں نے بھی اس کا ہاتھ بٹایا چنانچہ یہ ناپاک منصوبہ باندھ کر ابو جہل
 نے عمار کو چھوڑ دیا اور انھیں کچھ دلوں کے لئے حسبانی اور روحانی اذیتوں
 سے نجات مل گئی۔ شاید انھوں نے بھی یہ سمجھا سے کہ اب آدمائشوں اور
 فتنوں سے مجھے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل ہو گیا۔ عمار کا یہ دستور تھا

کہ وہ روزانہ صبح کو ارقم کے گھر جاتے، اللہ کے رسول سے دین کی باتیں
 سیکھتے، آپ سے تباہ کن خیالات کرتے اور شام کو اپنے گھر آکر سو جاتے انہوں
 نے اپنے گھر میں ایک ایسی چیز بنالی تھی جس کا اب تک کسی مسلمان کو خیال
 بھی نہ تھا۔ اپنے گھر میں ایک چھوٹی سی مسجد بنالی تھی جس میں اللہ کی
 عبادت بڑے شوق و ذوق سے کرتے رہتے تھے۔ آخر کار حق تعالیٰ
 نے انہیں کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی :-

أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاءَ اللَّيْلِ سَاجِدًا وَقَائِمًا
 يَحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيُرْحَمُهُ رَبُّهُ قُلْ هَلْ
 يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ
 إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝ (زمر)

جلا جو شخص اوقات شب میں سجدہ و قیام کی حالت میں دعا کر رہا
 ہو، آخرت سے ڈر رہا ہو اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہو (کیا
 وہ اور ایک جاہل برابر ہے) آپ فرمادیجئے کہ کیا عالم اور جاہل برابر
 ہو سکتے ہیں۔ دانشمند ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

ایک دن صحابہ کرام دار ارقم میں جمع ہوئے ہیں، جب خوب دن چڑھ
 جاتا ہے تو اس مجلس میں عمار کو نہیں دیکھتے، حضرت سے ذکر کرتے ہیں، آپ
 فرماتے میں عمار کو اللہ کی راہ میں غدا ب دیا جا رہا ہے، پھر آپ بطحا کو کسی

نب سے گذرتے ہیں اور وہاں ابو جہل کو دیکھتے ہیں، کہ کم بخت اپنی پہلی حماقتوں
 تر آیا ہے۔ ایک طرف انتہائی تیز آگ بھڑک رہی ہے دوسری طرف چمڑے
 ہتھیوں میں پانی بھرا ہوا ہے بیچ میں عمار ہاتھ پاؤں بندھے پڑے ہیں قریشی
 دان نیروں سے آہستہ آہستہ ان کا جسم چھید رہے ہیں اور آگ میں جلا رہے
 ہیں۔ عمار خاموش ہیں اور دل ہی دل میں خدا کو یاد کر رہے ہیں، کسی سے
 یہ نہیں کہتے۔ جب اللہ کے رسول صلعم نے یہ خوفناک نظارہ دیکھتے ہیں تو
 ان کی طرف دیکھ کر کمال شفقت سے فرماتے ہیں۔

يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ عِمَارٍ كَمَا كُنْتَ
 بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ۝

اے آگ عمار پر ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جا، جیسے حضرت ابراہیم

پر ٹھنڈی اور سلامتی والی بن گئی تھی۔

ابو جہل نے اس طویل مدت میں عمار کو اس قدر آگ سے جلایا تھا،
 کہ وہ ان کی جان لینے کے لئے کافی تھی، لیکن حق تعالیٰ کا فرمان ہے
 اَدْعُرْنِي اَسْتَجِبْ لَكَرَجِدْ مِنْ جَدِّكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَكْفُرَ بَكَ اِنَّكَ
 كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ۔ آج عمار
 کے لئے اللہ کے بڑے پیارے اور پسندیدہ بندے نے دعا مانگی تھی، بھلا
 کیسے قبول نہ ہوتی۔ خدا کی حکمت بڑی کامل ہے اور ہر کام کی ایک مقررہ
 مدت ہے۔ آج بھی عمار نے اسی ایسی تکلیفیں برداشت کر لیں جن کی مشکل

ہی سے لوگ تاب لاتے ہیں بلکہ عوام کی برداشت سے باہر ہوتی ہیں۔ جب
 سوچ ڈوبنے لگا تو خدا خدا کر کے ان پر ظلم و ستم موقوف ہوا اور اپنے گنہگار
 خیریت سے پہنچ گئے۔ ابو جہل نے عمار کو پھر ایک طویل عرصے کے لئے چھوڑ
 رکھا، جیسے وہ بھول گیا ہو۔ اب پھر عمار کو خیال آنے لگا کہ شاید اب ان پر
 مظالم نہ توڑے جائیں گے۔ لیکن ابو جہل ان سے غافل نہ تھا۔ چند دنوں
 کے لئے انہیں صرف اس لئے چھوڑے رکھا تھا کہ مظالم میں سنگینی
 پیدا کی جائے اور ستم ایجادی میں کوئی اور نیا ڈھنگ اختیار کیا جائے۔
 ایک دن اللہ کے رسول صلعم عمار کو دیکھتے ہیں، کمال غمگین ہیں، چہرے پر
 اُداسی چھا رہی ہے آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں۔ آپ ان کے قریب تشریف
 لائے کمال شفقت سے ان کے آنسو پونچھے اور فرمایا، ارے یہ کیا کر رہے
 ہو کیوں رو رہے ہو۔ بس یہی بات ہے تاکہ غنڈوں نے تمہیں پانی میں غوطے
 پر غوطے ایسے اور تم نے گھبرا کر نامناسب الفاظ کہہ دیئے۔ خیر اچھا ہوا تم نے
 کہہ دیئے اس میں کوئی حرج نہیں آئندہ بھی کہہ سکتے ہو۔ پھر کافروں نے عمار
 کو کافی دنوں تک چھوڑے رکھا اور جب پاؤں تو خوب ہی ستایا، مگر پھر
 چھوڑ دیا، عمار شرم و حیا سے پانی پانی ہو گئے۔ اللہ کے رسول کی خدمت
 گرامی میں افسردہ و بے نشان حاضر ہوئے۔ آنکھوں میں آنسو تھے، چہرے پر
 ہواسیاں اڑ رہی تھیں اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

رسول اللہ صلی علیہ وسلم: ہمارا آج کیا بات ہے؟

ہمارے دوستوں نے کہا کہ یا رسول اللہ نہایت بُرا حادثہ پیش آ گیا۔ ہمارے
یہاں عرض کروں کم بختوں نے اُس وقت تک مجھے نہیں چھوڑا جب تک میں نے
اُپ کی شانِ مبارک میں گستاخانہ اور اُن کے خداؤں کے بارے میں اُن
کی مرضی کے مطابق کلمے استعمال نہ کر لیے۔ یہ کہا کہ عمار زرارہ نے لگنے
رسول اللہ صلی علیہ وسلم: اس وقت تمہارے دل کا کیا حال تھا عمار!

عمار: یا رسول اللہ! تو بہر وقت ایمان و یقین سے بسر فرماتا ہے۔
رسول اللہ: فکر نہ کرو، کوئی مضائقہ نہیں، اگر غلطی پھر تمہارے ساتھ
یہی معاملہ کریں تو پھر ایسا ہی کرنا۔ اُس واقعہ کے بعد فوراً یہ آیت اترائی:

مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أَكْرَهَ
وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ وَلَكِنْ مَنْ شَرَحَ
بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِنَ اللَّهِ وَلَهُمْ
عَذَابٌ عَظِيمٌ

(نحل ۱۰۶)

جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کر لے (مگر جس میں بددستیا
کی جائے بشرطیکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو) لیکن جو جی کھول کر کفر
کرے تو ایسوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا اور انہیں بڑی سزا ملے گی
اس بار بار پڑھنے والے عذاب سے ہمارے اس وقت نجات پائی

جب حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو حبشہ کی ہجرت کا حکم دے دیا۔
 عمار ہجرت کر کے حبشہ پہنچ گئے اور پھر کچھ زمانے کے بعد وہاں
 مدینہ میں تشریف لے آئے۔ جہاں اللہ کے رسولؐ کے ساتھ
 سلامتی کے ساتھ اطمینان و مسرت کی زندگی گزارنے لگے۔

مدینہ کی ہجرت

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثِيَابِ الْوَدَاعِ
 وَجِبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَا دَعَانَا اللَّهُ حَاعِ
 دَلِ بَيْتَابِ وَهَ آئِينَ كَغَيْبِ آتَى هَ
 صَبْرُ كَرِصْبِ ذَرَامِيرِ مَجْلَنِي وَلِي

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مبارک دعوت، اپنی مبارک
 ذات اور صحابہ کے بارے میں یثرب کے دو لوں قبیلوں اوس و خزرج
 سے ایک معاہدہ کر لیتے ہیں جس میں یہ بات طے پاتی ہے کہ انصاف
 اپنے ہاں آپ کو پناہ دیں آپ کے پشت پناہ نہیں، آپ کی مدد کریں، اور
 آپ کی طرف سے ڈٹ کر باغیوں کا مقابلہ کریں تاکہ آپ خداوند قدوس
 کا پیغام دنیا کو امن و عافیت کے ساتھ پہنچاتے رہیں۔ اس معاہدے کو
 اوس و خزرج نے مان لیا، اس پر دستخط کر دیے اور آپ کے ہاتھ پر بیعت
 کر لی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور تمام مسلمانوں کو مدینہ کی ہجرت کا حکم دیدیا

مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی یثرب میں اسلام پہنچ چکا تھا۔ اللہ کے رسول
 کے بھیجے ہوئے ایک مبلغ نے یثرب میں اسلام کی خوبیاں بیان کر کے
 چند لوگوں کو مسلمان بنا لیا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کی ہجرت ایک ایسے
 شہر کی طرف ہو رہی تھی جو اسلام کا ایک پیامبرؐ کی تحریک بن چکا تھا۔ ہجرت
 کا حکم ملتے ہی صحابہ کرام کے قافلے کے قافلے یثرب میں آگے لگے۔ آپ
 ابھی مکہ ہی میں تشریف فرما تھے اور اپنی ہجرت کے لئے پروردگار عالم کے
 حکم کے منتظر تھے۔ ایک دن آپ کی آمد کی خبر سن کر مسلمان مہاجرین ان
 بھائیوں کے ساتھ قبا میں اکٹھے ہو گئے اور رحمتہ للعالمین کی آمد کا انتظار
 کرنے لگے۔ قبا کے دوران قیام میں مہاجر مکہ کی طرح یہاں بھی نماز پڑھا کرتے
 تھے۔ اور انھیں ایک امام کی ضرورت درپیش تھی۔ مسلمانوں نے امامت کے
 لئے سالم بن ابی حدیفہ سے بہتر کسی کو نہیں پایا کیونکہ وہ ایک اچھے قاری
 اور بہترین حافظ تھے۔ آخر کار انھیں امام چن لیا گیا۔ حالانکہ ان میں بڑے
 بڑے صحابہ موجود تھے۔ مثلاً فاروق اعظم جن کا اسلام مسلمانوں کے لئے
 باعث خیر و برکت، ہجرت سبب نصرت و حمایت اور خلافت پیام رحمت
 و رافت تھی جیسا کہ بعد میں ابن مسعود نے فرمایا ہے۔ اوس و خزرج
 کے منافق اور مشرک لوگ مسلمانوں کی اس چھوٹی سی جماعت کو دیکھتے
 تھے جو مہاجرین و انصار پر مشتمل تھی اور جن کی امامت کے خالص سالم

بن ابی خلیفہ کے سپرد تھے۔ سالم کو امام دیکھ کر شروع شروع میں تو
 انہوں نے ان کو کوئی بڑا آدمی سمجھا، لیکن پھر فوراً ہی انہیں یاد آ گیا کہ
 اوہ یہ تو وہی لڑکا ہے۔ جسے سلام تاجر ہمارے پاس فروخت کرنے
 لایا تھا۔ اب انہوں نے سالم کو اچھی طرح سے پہچان لیا اور آپس میں
 ایک دوسرے سے کہنے لگے تم اُس کو نہیں دیکھتے جو ہاجرین و انصاریوں
 کی اس چھوٹی سی جماعت کو نماز پڑھا رہا ہے۔ اس اعزاز کو دیکھ کر
 یہ لوگ دنگ رہ گئے اور کہنے لگے کہ یہ لڑکا سالم ہے۔ سالم کو جلتے
 ہو کون ہے؟ آخر انہوں نے دماغ پر زور ڈالا اور یاد کرنے کی کوشش
 کی۔ اتنے میں ایک پرانا شخص بول اٹھا کہ یہ تو سلام یہودی کے
 ساتھ تھا۔ وہ اسے فروخت کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت یہ لڑکا
 نہ اچھی طرح عربی بول سکتا تھا اور نہ سمجھ ہی سکتا تھا۔ لوگ سلام کا نام
 سنتے ہی اچھل پڑے، اور سالم کا پورا نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے
 پھر گیا، انہیں یاد آ گیا کہ اس وقت بیچارے کی حالت قابل رحم تھی
 بھوک اور افسردگی چہرے پر چھا رہی تھی، کسی کو بھی پسند نہیں آیا
 تھا، آخر کار ایک رحم دل خاتون بیٹہ نے اسے خرید لیا تھا کیونکہ اس کی
 حالت زار دیکھا گیا اس پر تم سے آ گیا تھا، پھر آپس میں ایک دوسرے
 سے کہتے ہیں کہ اگر آج سلام زندہ ہوتا تو اپنے اس لڑکے کے اعزاز

کو دیکھ کر حیران رہ جاتا اور خوشی سے پھولا نہیں سنا تا پھر کچھ اور لوگ طنز
 طور پر کہنے لگے۔ محمد کے ملنے والوں کو تو دیکھو ان کی امامت ایک
 ایرانی کر رہا ہے جو کل تک غلام تھا۔ "واقعی ان لوگوں کے طور طریقے
 برلے ہیں۔ یہ غلاموں کو سردار بنانے لگے۔ اور غلام و
 آغاؤں کے درمیان جو خلیجیں حائل تھیں، انھیں پاٹ رہے ہیں۔ یہی کہ
 کہیں ہمیں تو قریشیوں پر ترس آتا ہے پچارے کیسی کیسی مصیبتوں
 میں پھنس گئے ہوں گے۔ انھوں نے محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ
 جو کچھ کیا وقت کا وہی تقاضا تھا ہم انھیں معذور سمجھتے ہیں۔ اگر قریشیوں
 کی طرح ہمارے پاس بھی طاقت ہو تو ہم بھی انھیں شہر بدر کر کے ہی دے
 لیں، اور اس کاٹے کو پہلو میں کھٹکنے نہ دیں۔ لیکن افسوس ہم بیدست
 و پاپ ہیں۔" ایک نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا: "ارے انھوں نے تو ہماری
 قوم کے بڑے بڑے لوگوں کے دل موہ لئے۔ ہمارے سردار انھیں مانے
 لگے اور محمدؐ پر ایمان لے آئے جن کے ہاتھ میں سیاہ و سفید ہے دوسرا
 بولا:۔ چند لوگ خاموش رہے اور کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ البتہ اس بار
 میں انھیں تحقیق کا شوق دا منگیں ہوا، لیکن جب سالم کے حالات سنائے
 آئے تو یہ بھی دنگ رہ گئے۔ پھر ان لوگوں نے اس جماعت کے اور
 لوگوں کی زندگی کے حالات معلوم کئے تو ان میں اکثر و بیشتر غلام

نکلے جو اب آزاد ہیں اور بڑی پوزیشن کے مالک ہیں۔ پھر یہ لوگ مقامی لوگوں
 کا ان آزاد کردہ غلاموں کے ساتھ برتاؤ دیکھ کر انگشت بندھا رہ گئے
 اسلام نے سب کو بھائی بھائی بنا دیا۔ سب کے حقوق یکساں ٹھہرائے
 سب میں مساوات قائم کر دی۔ جیسے ایک ہی خاندان کے چند ممبر ہوتے
 ہیں۔ سب کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا ہے اور سب کو ایک
 ہی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ آج ان غلاموں کے ساتھ بھی وہی منصفانہ
 عادلانہ اور فیاضانہ برتاؤ کیا جا رہا ہے جو کل تک سراسر محروم و بے
 سرو سامان تھے۔ آخر انہوں نے اس مساویانہ سلوک کو اپنی قوم کے
 مسلمانوں سے پوچھا تو انہوں نے بتایا۔ دراصل اسلام نے انسان کو
 اس کا اصلی مقام عطا فرمایا ہے، وہ غلام و آزاد کے امتیاز کا قائل
 نہیں وہ یہ کہتا ہے کہ انسانیت میں دونوں برابر ہیں اور حقوق
 انسانیت میں کوئی بھی کسی سے کم نہیں سب آدم کی اولاد ہیں، البتہ
 نیکی، پارسائی، بھلائی، اور نیکی عملوں سے ایک دوسرے سے
 جدا ہوتے ہیں۔ پھر جس قدر نیکیو کار اور پارسا ہوگا۔ اسی قدر خدا
 کی نگاہ میں لائق اعزاز و اکرام ہوگا۔ جب ان لوگوں نے مسلمانوں
 کا یہ زریں اصول سنا اور اس پر غور کیا تو ان کے دلوں میں بھی اس
 اصول کی خموشی و رغبت پیدا ہوئی اور یہ آرزو کرنے لگے کہ ان

کے ہاں بھی اگر یہ عادلانہ اصول ہوتا تو کیا اچھا ہوتا۔ آخر رفتہ رفتہ ان کے دل اسلام کی طرف مائل ہونے لگے اور دھیرے دھیرے شرب کے باشندے حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے۔ اسلام لانے کے بعد ان کے دلوں میں بھی یہی امنگ اٹھی کہ ان کی امامت سالم ہی کریں جو کل تک غلام تھے۔ مگر اسلام نے انہیں ایک اعلیٰ مقام عطا فرما دیا تھا۔ اور آج ان کی خوش قسمتی ملاحظہ ہو کہ وہ قریشیوں کی اور اوس و خزرج کے بڑے بڑے لوگوں کی امامت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

دینی شوق ہو تو ایسا ہوا!

کہاں تھے یہ نصیب اللہ اکبر سناگ اسود کے
 یہاں کے پتھروں نے پاؤں چُمنے تھے محمد کے
 مسلمان بڑی بے چینی سے اللہ کے رسول فداہ ابی و اُمّی
 کی آمد کا انتظار کر رہے تھے، اور سراپا شوق بنے ہوئے آپ کے
 خیر مقدم کے لئے قبائے کئی کئی میل دُور نکل جاتے تھے، تاکہ
 آپ کے دیدار سے آنکھوں کو ٹھنڈک اور دلوں کو راحت پہنچا یا
 آخر ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر کے ساتھ
 قبائیں پہنچ ہی گئے۔ قبائوں نے آپ کا بڑا شاندار استقبال
 کیا اور آپ کو سرا اور آنکھوں پر بٹھایا۔

بٹی یا مال سترے کو اجازت اہلہانے کی
 ہوئی آنسو بھری آنکھوں کو جرات مسکرنے کی
 آپ نے اپنے استقبال کرنے والوں کا احترام کیا اور سواری سے

انز پڑے۔ رحمۃ للعالمین مدینہ کی ہجرت سے بڑے خوش تھے، اور بلاشبہ مدینہ بھی آپ کے تشریف لانے سے باغ باغ تھا۔ ہر وقت آپ کے پاس ملنے والوں کا ایک میلہ سا لگا رہتا تھا۔ ہر گھر میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ مدینہ کی ہر گلی میں آپ ہی کا ذکر خیر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے عمر بھری عیدین اکھٹی ہو گئی ہوں انصار اپنے مقدس مہالوں کی خاطر تواضع میں اور حسن مدارات میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ مہاجرین کو پناہ دے رہے تھے، ان کی ضرورتوں کا خیال رکھ رہے تھے ان سے خوش ہو ہو کر باتیں کر رہے تھے، اور ان کے لئے ہر قسم کی سہولتیں فراہم کر رہے تھے۔ جب آپ قبا تشریف لائے تو کافی دن چڑھ چکا تھا بلکہ زوال کا وقت قریب تھا۔ آپ نے تشریف لاتے ہی ظہر کی نماز کا اہتمام فرمایا اور قبا میں سب سے پہلے آپ کی امامت میں ظہر کی نماز ادا کی گئی۔ پھر ایک انصاری ایک طباق بھر کر تازی تازی کھجوریں لائے اور رحمۃ للعالمین فداہ ابی و امی اور آپ کے دونوں رفیق صدیق اکبر اور فاروق عظیم طباق میں سے ایک ایک کھجور اٹھا کر تناول فرمانے لگے۔ ابھی یہ حضرات کھجوریں کھا ہی رہے تھے کہ انہیں دور سے گروا ٹھٹی ہوئی دکھائی دی،

جیسے کوئی آ رہا ہو۔ پھر دُور سے ایک شخص آتا دکھائی دیا جو دم بدم
 قریب ہوتا جا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ شخص رحمة للعالمین کے قریب
 پہنچ ہی گیا اور سلام کر کے مجلس میں بیٹھ گیا۔ جانتے ہو یہ کون شخص تھا؟
 یہ روم کا پہلا پھل یعنی صہیب رومی تھے، جیسا کہ حضرت نے ان کے
 بارے میں فرمایا تھا، صہیب بڑی محنت و جاں فشانی سے مدینے
 پہنچے تھے۔ سفر کی تھکان نے ان کا بُرا حال بنا رکھا تھا۔ بھوک
 سے بڑھال تھے اور سفر کی گرمی سے آنکھیں بھی دکھنے آگئی تھیں،
 بڑی مشکل سے تھوڑا بہت نظر آ جاتا تھا، جب آتے ہیں تو حاضرین کو
 سلام کر کے زمین پر بیٹھ جاتے ہیں اور ذرا سستا کر ادھر ادھر دیکھتے
 ہیں تو سامنے کھجوروں کا طباق نظر آتا ہے۔ کئی دن کے بھوکے ٹوٹے
 ہی طباق پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور کھجوریں کھانا شروع کر دیتے ہیں۔
 فاروق اعظم: یا رسول اللہ ذرا صہیب کو تو ملاحظہ فرمائیے، آنکھیں
 دکھ رہی ہیں اور کھجوریں کھا رہے ہیں!
 رسول اللہ صلعم: صہیب! آشوبِ چشم میں کھجوریں کھا رہے ہو؟
 صہیب: (جلدی جلدی کھاتے ہوئے) یا رسول اللہ! میں اپنی تندست
 آنکھ کی بدولت کھا رہا ہوں۔
 صہیب کی اس حاضر جوابی پر رحمة للعالمین مسکرائے اور حاضرین

ہنس پڑے۔ لیکن وہ بدستور کھجوریں کھاتے رہے۔ جب خوب پیٹ
 بھر گیا اور سیر ہو گئے تو صدیق اکبرؓ سے ناراض ہو کر شکایت کرنے لگے کہ آپ
 نے مجھے اپنے ساتھ لے چلنے کا وعدہ فرمایا تھا مگر پھر بھی مجھے چھوڑ کر
 پھر ناراض ہو کر رسول اللہ صلعم سے کہنے لگے یا رسول اللہ! آپ نے
 بھی تو وعدہ فرمایا تھا شاید آپ بھی بھول گئے اور چھوڑ کر چلے آئے۔ خدا
 کی قسم میں نے اپنی تمام دولت دے کر قریشیوں سے صرف اپنی جان خریدی
 ہے۔ اس ترکیب سے ان کے شہر سے آیا اور خدمت گرامی میں حاضر ہوا
 کہ سے تین پاؤں آٹا لے کر چلا تھا جسے ابوار میں آکر گدھا تھا اور وہاں
 سے یہاں تک اسی پر گزارا کیا ہے۔

رحمۃ للعالمین :- ابو بکرؓ! تمہاری تجارت میں برکت ہی برکت ہے ابھی
 سودے میں تمہیں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کے
 پاس میں یہ آیت اتاری :-

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَشْرِي نَفْسَهُۥٓ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتٍ
 اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَوۡفٌ بِالْعِبَادِ ۝

(بقرہ - پارہ ۲ - نصف کے قریب)

بعض ایسے بھی لوگ ہیں جو اللہ کی رضا مندی تلاش کرنے کی غرض سے
 اپنی جان کو خرید لیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ بندوں پر بڑا مہربان ہے۔

پھر صہیب اپنی اس مفید تجارت کا واقعہ اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں، غلص مسلمانوں کی یہ عادت تھی کہ وہ خواہ مخواہ اپنے اسلام کی شیخیاں نہیں بھنگا کرتے تھے، نہ اس کا احسان چیتایا کرتے تھے، اور فخر و مباہات کو بھی برا سمجھتے تھے۔ رحمۃ للعالمین اور حضرت ابو بکر کی ہجرت سے قریشی معاملہ کی نزاکت کو خوب سمجھ گئے تھے۔ اور ان صحابہ کرام کو جو باقی رہ گئے تھے ہجرت نہیں کرنے دیتے تھے، بلکہ انھیں ڈرا دھمکا کر آبائی دین میں واپس لانے کی کوشش کرتے تھے۔ صہیب کو تنہا پا کر انھوں نے ہجرت کرنے سے روک دیا۔ "جب تو ہمارے شہر میں آیا تھا مجلس و گنگال تھا، تیرے پاس کچھ نہ تھا، کوڑی کوڑی کو محتاج تھا۔ آخر یہاں رہ کر تو اچھا خالص مالدار ہو گیا اور بڑے تاجروں میں شمار ہونے لگا۔ اب تیرا یہ ابادہ ہے کہ ہمیں چھوڑ کر محمدؐ اور ان کے ساتھیوں کے پاس چلا جائے اور ہمارے شہر کی کمائی ہوئی دولت اپنے ساتھ لے جائے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ہم تیری راہ میں مزاحم ہوں گے اور تجھے جانے نہ دیں گے" ابو جہل نے گرج کر کہا۔

صہیب نے آندہ ہو کر سوال کیا: "اگر یہ بات ہے تو میں اپنا سارا مال تمہارے حوالے کر جاؤں، جب تو مجھے جانے دو گے؟"

لوگوں نے ایک زبان ہو کر کہا: ہاں ہاں، پھر تو تمہیں روکے
 کاہیں کوئی حق حاصل نہیں، تمہیں اختیار ہے جہاں چاہو جاؤ اور رہو۔
 ابو جہل جھٹلا کر بولا: تمہیں نہیں، ہرگز نہیں، تیرے مال کی اتنی
 ضرورت نہیں جتنی تیری جان کی ہے، تم تجھے خوب مزہ چکھائیں گے اور
 تیرے مال پر بھی قبضہ کر لیں گے، پھر یا تو مارتے مارتے تجھے ختم کر دیں گے
 ورنہ اپنے آبائی دین میں واپس لے آئیں گے۔

صہیب نے آزرہ ہو کر تلخ لہجے میں جواب دیا: اگر آج عبداللہ
 بن عبدعان زندہ ہوتے تو تمہیں ہرگز یہ جسارت نہ ہوتی۔
 ابو جہل چیخا: اچھا اچھا، عنقریب تم تجھے عبداللہ بن عبدعان
 ہی کے پاس پہنچائے دیتے ہیں، اس سے بل کر ہماری شکایت
 کرنا، کیا تم لوگوں کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ زندگی بعد الموت حق ہے!
 صہیب نے سفیدگی سے جواب دیا: افسوس! آفت سے تمہاری
 عقل پر، بھلا اس دنیا میں میرا اور اس کا کیا تعلق، مجھ سے اللہ کے
 رسول نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے اور وہ دوزخ میں ہے۔

صہیب کا یہ جواب سن کر ابو جہل غصے سے تمٹھا اٹھا، اور
 جھپٹ کر صہیب کا منہ زور سے ایک طمانچہ مارا اور
 اپنے آدمیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا، "او تمیو! سن رہے ہو؟"

یہ بد بخت کیا بک رہا ہے، تمہارا سردار عبداللہ تو دوزخ میں ہے اور اس کا یہ رومی غلام جنت میں جا کے گا۔ ایسی ہی حالت کی بگو اس میں نے تو آج تک نہ دیکھی اور نہ سنی۔ پھر صہیب کو گرفتار کر کے بند کر دیا جاتا ہے۔ صہیب چند روز نظر بند رہتے ہیں اور انہیں بقدر سدر متق کھانے کو دیا جاتا ہے جس سے ان کا سانس چلتا رہے۔ چونکہ مکہ میں اور بھی مسلمان باقی رہ گئے تھے۔ علاوہ انہیں لوگ روز بروز مسلمان ہو رہے تھے، اس لئے کسی مسلمان کو صہیب پر ترس آ گیا اور اس نے کسی تدبیر سے انہیں قید سے نکال دیا، صہیب نے یہ موقعہ غنیمت سمجھا اور ایک سواری حاصل کر لی، پھر اس پر سوار ہو کر مدینہ روانہ ہو گئے۔ جب قریشیوں کو صہیب کے قید خانے سے بکل جانے کی خبر ہوئی تو ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ فوراً چند سواریوں کے تعاقب میں دوڑے گئے۔ ان شہسواروں نے کچھ دور جا کر صہیب کو جا لیا۔ جب انہوں نے ان چند سواریوں کو اپنے قریب دیکھا اور ان کا ناپاک غم بھی بھانپ لیا تو ٹھہر گئے اور ترکش میں سے تمام تیر نکال کر بڑے جوش کے ساتھ ان سے گرج کر بولے "کو نسا مائی کالال ہے جو مجھے پکڑنے کی جسارت کیے گا۔ خدا کی قسم جب تک میرے پاس یہ تیر ہیں کوئی میرے پاس پھٹک بھی نہیں

سکتا، تمہیں معلوم ہے کہ میں ایک ماہر تیر انداز ہوں، تیر ختم ہو جانے کے بعد اپنی تلوار سونت کر تمہارا ڈٹ کر مقابلہ کروں گا، اور جب تک میرے ہاتھ میں تلوار کا قبضہ ہے تمہیں اپنے پاس نہ آنے دوں گا، تمہاری خیر اسی میں ہے کہ میرے مال پر قبضہ کر لو اور چپ چاپ کان دیا کے چلے جاؤ۔ اگر چاہو تو میں تمہیں اس کا پتہ بھی بتا دیتا ہوں۔ یہ سوار بلا سوچے سمجھے چیخ پڑے کہ ہمیں تو پیسے کی ضرورت ہے اور تمہارا مشورہ ہمیں منظور ہے، اس کا پتہ اور نشان ضرور بتا دو۔“

صہیب نے انھیں وہ مقام بتا دیا جہاں ان کا مال تھا۔ اور یہ لوگ چپ چاپ واپس لوٹ آئے۔ اس طرح انہوں نے اپنے مال سے متاع ایمان خرید لی اور اس بیش بہا متاع کو الے کر خوشی خوشی مدینہ چل پڑے۔ آخر بڑی محنت و مشقت سے یہ طویل راستہ خدا خدا کر کے طے کیا اور اللہ کے رسول صلعم سے جامِ صافہ کی سفر کی صعوبتوں اور تکالیف نے انھیں ادھ مٹا کر دیا تھا مگر خیر سے مدینہ پہنچ گئے اور اللہ کا شکر بجالائے۔

رحمۃ للعالمین کے ایک ضاکر خادم

ابن مسعود دیگر صحابہ کی طرح حبشہ سے مدینہ تشریف لے آتے ہیں اور معاذ بن جبل یا سعد بن خنیسہ کے یہاں ٹھہر جاتے ہیں، جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے اور اس وقت تک ٹھہرے رہتے ہیں جب تک کہ رحمۃ للعالمین مدینہ میں لوگوں کے گھروں کی حد بند ہی نہیں فرمادیتے اور ہر خاندان کی ایک مخصوص جگہ کا تعین نہیں کر دیتے۔ آپ مسجد کے پیچھے زہریوں کے لئے حبکہ مخصوص فرمادیتے ہیں۔ قبیلے والے آپ سے عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ کے رسول صلعم آپ ابن ام عبد کو ہمارے پاس نہ ٹھہرائیں۔ اور ہم سے الگ ہی رکھیں، گویا انہیں ابن مسعود کا قیام ناگوار گذرتا ہے۔ آپ نے فرمایا: پھر مجھے کس لئے بھیجا گیا؟ حق تعالیٰ اس قوم کو برکت عطا نہیں فرماتا جو اپنے کمزوروں کی

حق تلفی کرتی ہے۔ پھر آپ نے انہی کے درمیان ابن مسعود کو
 ایک قطعہ زمین باعزت سکونت کے لئے عطا فرمادیا۔ ابن مسعود
 مدینہ میں سکونت اختیار کرتے ہی آپ کے رضا کارانہ خادموں میں
 شامل ہو گئے۔ آپ کی عمومی اور خصوصی زندگی میں ہر وقت عبداللہ
 بن مسعود آپ کے ساتھ رہنے لگے۔ آپ خلوت و جاوت میں اور
 اندر باہر ہر وقت آپ کی خدمت میں حاضر رہتے اور آپ کی پاکیزہ
 صحبت سے فائدہ اٹھاتے۔ جب رسول اللہ صلیم گھر میں تشریف
 فرما ہوتے تو یہ آپ کے در کی دربانی کرتے، اور جب آپ کہیں
 جاتے تو یہ عصا لے کر آپ کے آگے آگے چلتے۔ محدثین کہتے
 ہیں کہ ابن مسعود اللہ کے رسول صلیم کے سامان اٹھانے والے
 تھے، اور آپ کے بچھونے، نعلین مبارک اور وضو کے پانی کے
 منتظم تھے۔ جب رحمة للعالمین گھر میں تشریف لے جاتے تو یہ آپ
 کے حجرے کے دروازے پر چوکیدار بن کر پہرہ دیتے رہتے۔ سرکار
 رسالت ان سے کوئی بات نہیں چھپاتے تھے تا وقتیکہ اس بات
 میں خدا کے پاس سے کوئی حکم نہ آجائے۔ پھر جب آپ گھر سے باہر
 کہیں جانا چاہتے تو یہ آپ کو جوتا پہناتے اور عصا لے کر آپ کے
 آگے آگے چلتے اور جب کبھی آپ کہیں بیٹھنے کا ارادہ فرماتے

تو یہ آپ کا جو تا اُتار کر اپنی بغل میں دبا لیتے اور آپ کے دستِ مبارک میں عصا نہیں دیتے۔ پھر جب آپ چلنے کے ارادے سے کھڑے ہو جاتے تو یہ جھٹ آپ کو جوتا پہنا دیتے اور آپ سے عصا لے کر آگے آگے چل پڑتے۔ جب گھر پہنچتے تو حجرے کا پردہ ہٹا کر پہلے آپ گھر میں داخل ہوتے، اور پھر جب آپ گھر میں تشریف لے آتے تو دوڑ کر جلدی سے آپ کا جوتا اتارنے اور فوراً باہر نکل کر دروازے پر پہرہ دینے لگتے۔ سرکار رسالت جب کبھی سفر کا قصد فرماتے، تو سفر میں بھی یہ آپ کا بستر پوریا اٹھاتے اور وضو کے لئے پانی مہیا فرماتے۔ اور اگر کسی وقت آپ غسل کرنا چاہتے تو یہی پردہ روک کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ ان خدات کو دیکھ کر اکثر صحابہ تو ان کو آپ کے گھرانے کا ایک فرد سمجھتے تھے۔ اس انتہائی قرب اور کثرت صحبت سے یہ بات قابل حیرت و استعجاب نہیں کہ یہ سب سے زیادہ حافظ قرآن، اور سب سے زیادہ حافظ الحدیث ہیں۔ قرآن حکیم براہ راست رسول اللہ صلعم سے زیادہ تر انہوں ہی نے سنا تھا۔ اس لئے یہ آپ کی وفات حسرت آیات کے بعد قرآن حکیم کی تعلیم دینے، اور حدیثیں کہی کے ساتھ ڈرتے ڈرتے روایت کرتے۔ اللہ کے رسول صلعم ہر بات میں انہیں

کو ترجیح دیتے، ان کا بڑا ادب و احترام کرتے اور بسا اوقات ان کی حمایت و تعریف بھی کرتے۔ ایک دن تو آپ نے صاف فرمادیا تھا کہ اگر میں کسی کو بلا مشورہ امیر بنا تا تو ابن ام عبد کو بنا دیتا۔ ایک روز آپ نے انہیں حکم دیا کہ فلاں درخت پر چڑھ کر کچھ پھل چن لاؤ، جب وہ اس درخت پر چڑھنے لگے تو حاضرین ان کی تیلی تیلی ٹانگیں دیکھ کر منسنے لگے۔

اللہ کے رسول صلعم نے فرمایا: "منسنے کی کیا بات ہے؟" لوگوں نے جواب دیا: "ان کی تیلی تیلی ٹانگیں دیکھ کر منسنی آگئی۔" سرکار رسالت نے فرمایا:۔

إِنَّ سَاقَهُ لَأَنْقَلُ فِي الْمِيزَانِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ
مِنْ أَحَدٍ -

تم ان ٹانگوں کو دیکھ کر منس رہے ہو، لیکن قیامت کے دن یہی ہلکی پھلکی ٹانگیں میزان میں اُحد پہاڑ سے زیادہ وزنی ہوں گی۔ ابن مسعود مارتوں آپ کے ہرازا اور بستر و پانی کے منتظم رہے جب حق تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی کو اپنے پاس بلا لیا، اور مسلمانوں کا ایک لشکر شامیوں سے جنگ کرنے کے لئے شام کو روانہ ہوا، تو ابن مسعود بھی اسی لشکر میں شوق شہادت میں

جنگ کرنے کے لئے تشریف لے گئے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھو
 کہ اپنے حبیب کے بعد مدینہ میں ان کا ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ کچھ عرصے
 آپ حمص میں مقیم رہے۔ آخر کار حضرت عمر نے اپنی خلافت کے زمانے
 میں آپ کو کوفے کا معلم بنا کر بھیج دیا۔ پھر حضرت عثمان نے اس عہدے
 سے انھیں معزول فرمایا۔ آپ کافی عرصے تک کوفے میں سرکاری معلم
 کی حیثیت سے رہے۔

۲۴۴

جنگِ بدر

عجب انداز سے آئے خدا کے چاہنے والے
 زبانیں خشک، پوشاکیں دریدہ پاؤں میں جھالے
 مکہ میں ایک منادی آیا اور اُس نے یہ اعلان کر کے کہ ابوسفیان
 کا قافلہ گھرا ہوا ہے اور قافلہ سالار نے ان سے فوری مدد طلب
 کی ہے۔ قریشیوں کے دلوں میں خوف و دہشت کو بھر دیا۔
 اُس نے یہ بھی کہا کہ محمد کا یہ غزم ہے کہ وہ ہمارا قافلہ لوٹ لے
 اسی خیال سے وہ اپنے معتقدین کو لے کر مدینہ سے روانہ ہو چکا
 ہے۔ یہ وحشت ناک خبر سن کر قریشی گھبر گئے، اور ابھی دن چڑھا
 بھی تھا کہ قریشی سردار جنگ کی تیاریوں میں لگ گئے۔ شرفار
 اور سرداروں کے تو دل کو لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے اس سلسلے
 میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کی تمنا تھی کہ اڑ کر
 جاہو نجیس اور قافلے کو تباہی سے بچالیں۔ ابو جہل کو یقین تھا

کہ اب وہ وقت آپہنچا ہے جس کا اُسے کافی عرصے سے انتظار
 تھا اور یہ بھی اس کا غم تھا کہ قریشی محض قافلہ بچانے کے لئے مکہ
 نہ چھوڑیں گے بلکہ محمدؐ اور اُس کے ماننے والوں کو صفحہ ہستی
 سے مٹا کر مکہ اور یثرب کو ان کی ریشہ دوانیوں سے بچالیں گے۔
 مکہ سے ایک ہزار جوانوں کا لشکر جرار اکٹرا ہوا نکلا جس میں بڑے
 بڑے لوگ بھی شامل تھے، کیونکہ انھیں اکابر نے جنگ میں بڑھ
 چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ابھی مکہ سے کچھ ہی دور نکلے تھے کہ مخبر نے
 خبر دی کہ ابوسفیانؓ بڑی ہوشیاری سے سمندر کے کنارے
 کنارے آ رہا ہے، محمدؐ سے اپنے قافلے کو بچانے میں کامیاب ہو گیا
 ہے، اور اُن کی زد سے صاف نکل آیا ہے۔ اس لئے قریش مکہ
 واپس لوٹ جائیں، اور امن و عافیت سے رہیں سہیں۔ لیکن قریشیوں
 نے مکہ سے نکل آنے کے بعد خالی ہاتھ واپس ہونا اچھا نہ سمجھا اور شیطان
 نے ابوجہل کی زبانی یہ بات اُن کے ذہن نشین کر دی کہ یہ جو جوانوں
 کا لشکر مقام بدر تک جا کے اور وہاں شاہانہ شان و شوکت
 اور رعب و دبدبے کے ساتھ ٹھہرے تاکہ عرب کو معلوم ہو جائے
 کہ قریشیوں کی اس گزے گزرے زمانے میں بھی وہی سیادت
 و قیادت باقی ہے اور اب بھی اُن میں وہی دم خم باقی ہے جو ان کا

مخصوص حصہ ہے۔ اس مقام میں تین دن ٹھہرا جائے۔ خوب اونٹ
 بیچ کئے جائیں، شراب و کباب کا دور چلتا رہے اور خوب دادِ عیش
 دیں، گردو نواح کی لہستیوں کو بھی اس جشنِ مسرت میں
 شریک کر لیں تاکہ محمد کو اور مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ آج بھی
 پہیل کا بول بالا ہے، اور قریشیوں کی غرت و سطوت پیدا کرنا
 بڑے دل گردوں والے کا کام ہے۔

اس جنگ میں جہاں اور سردار شامل تھے وہاں سہیل بھی
 ساتھ تھا۔ سہیل نے اپنا سارا ساز و سامان اپنے صاحبزادہ عبداللہ کے
 حوالے کر دیا تھا اور خود حالی ہاتھ اُس کے آگے آگے چل رہا تھا۔
 سہیل نے اپنے فرزند عبداللہ کو خنیشہ سے ملنے واپس آنے کے
 بعد طرح طرح کی اذیتیں پہنچا کر توحید کی راہ سے ہٹانا چاہا تھا۔
 سہیل نے عبداللہ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک تنگ دتار یک
 کوٹھری میں ڈال دیا تھا، اور جب تک اُسے اس بات کا یگانہ یگانہ
 نہ ہو گیا کہ اب عبداللہ اپنے آبائی دین میں واپس لوٹ آیا ہے۔
 اس وقت تک اُس نے انھیں رہا نہیں کیا تھا۔ چونکہ عبداللہ سہیل
 کو پورا پورا بھروسہ اور اعتماد تھا اسی لئے اپنا ساز و سامان اُن کے
 سپرد کر کے اطمینان سے آگے آگے چلنے لگا۔ بدر کے مقام پر حق و باطل

کا معرکہ گرم ہوا اور دونوں فریق ایک دوسرے کے مقابلہ پر ڈٹ کر
 کھڑے ہو گئے۔ قریشیوں نے جب محمدؐ کی جماعت پر نظر دوڑائی تو
 انھیں ان کے ساتھ مسطحی بھرا دمی نظر آئے۔ یہ دیکھ کر وہ اور اکبرؓ
 اور کبر و غرور میں چور نظر آئے۔ رحمۃ للعالمین نے بھی دشمن کے لشکر
 کو گہری نگاہوں سے دیکھا۔ آپ نے دیکھا کہ چھوٹے بڑے سارے
 قریشی موجود ہیں، اور یوں ساز و سامان کے ساتھ ہیں۔ اس
 وقت آپ نے حق تعالیٰ سے دعا مانگی کہ وہ اپنا وعدہ پورا فرمائے
 غیبی امداد بھیجے اور مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط بنائے۔ پھر دونوں
 فریق بالکل ہی قریب آ گئے۔ قریشیوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی
 اور مسلمانوں کو بھی یہ خیر انوکھی معلوم ہوئی، لوگوں نے دیکھا کہ ایک
 سنگفتہ چہرے والا، گٹھنیلے جسم والا بڑا قوی اور تند رست و توانا
 کڑیل نوجوان لشکر قریش میں سے نکل کر مسلمانوں کے لشکر کا
 رخ کر رہا ہے۔ مسلمانوں نے بھی خصوصاً مہاجرین نے اسے اس
 پرانے دوست کو دیکھا، جس پر پہلے تو وہ جانیں چھڑکتے تھے۔ مگر
 بعد میں جب انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ یہ اپنے آبائی دین میں لوٹ
 گیا ہے تو اس پر افسوس کر رہے تھے۔ قریشی اس کڑیل نوجوان
 کی یہ حرکت دیکھ کر انکاروں پر لڑنے لگے اور آپس میں ایک دوسرے

سے اس کے بارے میں پوچھنے لگے۔ اکثر مسلمانوں میں بھی اس کی بابت چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ تھوڑی دیر میں سب کو معلوم ہو گیا کہ یہ عبداللہ بن سہیل بن عمرو ہے جنہوں نے حکمتِ عملی سے کام لے کر مشرکوں کو اپنے بارے میں دھوکہ میں رکھا، اور حق تعالیٰ کے اس فرمان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا، جو عمار بن یاسر کی شان میں اتارا گیا تھا۔ (یہ آیت اُپر گزر چکی ہے) وہ بظاہر مشرک تھے مگر ان کے دل میں شرک نہ گھس سکا تھا۔ وہاں ایمان کی روشنی جگمگا رہی تھی، اور عمار کے دل کی طرح ایمان و یقین سے لبریز تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمار سے فرمایا تھا کہ اگر قریشی تمہیں اذیت پہنچائیں تو پھر تم زبان سے وہی کلمہ کہدینا جسے وہ کہلوانا چاہتے ہیں۔ عبداللہ اس آیت کا اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اچھی طرح مطلب سمجھ چکے تھے۔ جب انھیں باپ نے قسم قسم کی اذیتیں پہنچائیں تو انھوں نے قریشیوں کی موجودگی میں سہیل کے آگے ان تمام باتوں کا زبانی اقرار کر لیا جو انھیں پسند تھیں اور انھیں ناپسند تھیں مگر دل میں ایمان و یقین ہی تھا.....

اب جبکہ دونوں جاہلیں جنگ کرنے کے لئے آمنے سامنے کھڑی ہو گئیں تو عبداللہ اس موقع کو فہمیت سمجھا اور اس سے فائدہ اٹھانے

میں اور مشرکوں کے لشکر سے نکل کر مسلمانوں کے لشکر میں جا
 پہنچتے ہیں۔ جب اللہ کے رسول کے قریب پہنچتے ہیں تو آپ
 کو سلام کہتے ہیں اور آپ کی دعائیں لے کر اپنے دوستوں سے
 ملتے ہیں اور قریشیوں سے جنگ کرتے ہیں جن میں ان کا باپ
 سہیل بھی شامل ہے۔ اسی اثنا میں اپنے بہنوئی ابو خذیفہ سے
 ملاقات کرتے ہیں اور انھیں اپنا پورا واقعہ سناتے ہیں۔ ابو خذیفہ
 انھیں شاباشی دیتے ہیں اور ان کی ہوشیاری کی تعریف کرتے
 ہیں اور کہتے ہیں بہت ہی اچھا ہوا۔ جب دونوں گروہ سینہ بہ سینہ
 ہو جاتے ہیں اور ان میں تلوار یا تیر چلنے کی دیر باقی رہ جاتی ہے، تو
 قریشی ایک بات دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں، اسی طرح مسلمان بھی
 انگشت بدندان رہ جاتے ہیں۔ ایک نوجوان مسلمان اسلامی لشکر سے
 نکلتا ہے اور قریشیوں کے سالار لشکر عتبہ کو مقابلے کے لئے لکارتا
 ہے۔ عتبہ بھی بیچ و تاب کھاتا ہوا اس کے مقابلے پر آتا ہے، لیکن
 اس کی صورت دیکھتے ہی اُسے پاؤں واپس ہو جاتا ہے۔ قریشیوں کا
 غصہ بھڑک اٹھتا ہے کیونکہ واقعہ کی نوعیت عجیب و غریب ہے۔
 اور مسلمان بھی دنگ رہ جاتے ہیں۔ یہ نوجوان ابو خذیفہ ہے جو اپنے
 باپ عتبہ کے مقابلے کے لئے اللہ کی رضا کے لئے ڈٹا ہوا ہے۔ جنگ

کے شعلے بجھ جانے کے بعد ہندہ بنت عتبہ کو خبر ملتی ہے کہ عتبہ، ولید اور شیبہ (باپ، بھائی اور چچا) تینوں میدان میں کھیت رہے، اُسے یہ بھی خبر ملتی ہے کہ اس کے بھائی ابو خذیفہ نے اُس کے باپ عتبہ کو مقابلے کے لئے میدان جنگ میں طلب کیا تھا۔ یہ سن کر وہ بھٹنا جاتی ہے، خوب خوب صلواتیں سناتی ہے اور فی البدیہہ یہ شعر کہتی ہے جس میں ابو خذیفہ کی مذمت ہے:-

الْأَحْوَالُ الْأَنْعَلُ الْمَشْوُورُ طَارِوَةٌ

أَبُو خَذِيفَةَ سَرُّ النَّاسِ فِي الدِّينِ

أَمَا شَكَرْتَ أَبَا رَبِّكَ مِنْ صَغِيرٍ

حَتَّى سَبَبْتَ شَبَابًا غَيْرَ مُحْجُونٍ

اے بھنگے، دانتو منحوس ابو خذیفہ جو دین میں بدترین شخص ہے، کیوں تو نے اپنے اس باپ کا شکر ادا نہیں کیا جس نے تجھے کم سنی میں کالا پوسا اور تو نے بے دانغ جوانی پائی۔

اس جنگ میں عبداللہ بن مسعود بھی شریک تھے۔ اگرچہ یہ پہلے تلے لاغرا اور نحیف تھے لیکن ان میں غضب کی چستی اور بلا کی پھرتی تھی جیسے کوئی چھلاوہ، ابھی یہاں اور ابھی وہاں، میدان جنگ میں بھی ان کا وہی دستور تھا جو مکی زندگی میں دوران ابتلا میں تھا۔

ابن مسعود ایک زخمی شیر کی طرح حملہ کرتے پھر رہے تھے۔ ابھی
 ادھر حملہ کیا اور ابھی ادھر دھاوا بولا۔ میدان میں ہر مقام پر لڑتے
 اور حملہ کرتے دکھائی دیتے تھے۔ اتنا جنگ میں اُن کی نگاہ دو گنسن
 مسلمانوں پر پڑتی ہے۔ عفرات کے دو سعادت مند بیٹے عقاب
 کی طرح اپنے شکار ابو جہل پر ٹوٹ پڑتے ہیں، اور بیک چھلکنے
 میں اُسے مار گرتے ہیں۔ ابن مسعود نے اس موقع سے فائدہ
 اٹھایا فوراً ابو جہل کے پاس پہنچے، ابھی کم بخت سسک رہا تھا لیکن
 اتنا دم باقی تھا کہ دیکھا اور سن سکے۔ اور رُک رُک کر بول بھی سکے۔
 ابن مسعود لپک کر اس کے سینے پر سوار ہو جاتے ہیں اور اُس سے
 گریح کر کہتے ہیں "اے اللہ کے دشمن دیکھ خدا نے تجھے کیسا ذلیل و
 خوار کیا، اے گڈریے تو مشکل سے پڑھی جانوالی جگہ پر پڑھا ہوا ہے۔ ابو جہل نے میرا
 آواز میں رُک رُک کر کہا "مکینے پاجی اب ذرا دنیا کا فرہ چکھ آخرت کا عذاب اس سے
 کہیں زیادہ سخت اور خون کے آنسو رلانے والا ہوگا۔" پھر انہوں نے اس
 پیکرِ فتنہ و فساد کا سرا ڈا دیا اور دڈر کر سرکار رسالت کی خدمتِ اقدس میں
 پہنچے، اور کہتے لگے "یا رسول اللہ مبارک ہو میں نے ابو جہل کا سر قلم
 کر دیا ہے۔ اللہ کے رسول صلعم نے بلند آواز سے فرمایا۔ اللہ اکبر اللہ
 کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ آپ کے ساتھ تمام مسلمانوں نے

نعرہ تکبیر بلند کیا جس سے میدان جنگ گونج اٹھا۔ جنگ ختم ہو گئی۔
 لاشیں گھسیٹ گھسیٹ کر ایک پرانے کنویں میں ڈال دی گئیں۔ ان
 کے رسول ان لاشوں کے پاس کھڑے ہو کر فرما رہے ہیں۔ اے کنویں
 والو! کیا تم نے اپنے رب کا وعدہ سچا پایا؟ مجھ سے میرے رب نے جو
 وعدہ فرمایا تھا وہ تو سچا ہی ثابت ہوا۔ "بعض صحابی بول پڑے، یا
 رسول اللہؐ یہ تو سب بے جان ہیں، فرمایا تمہاری طرح یہ سن رہے
 ہیں مگر بول نہیں سکتے۔"

۲۸۲

مُؤَذِّنِ رَسُولِ اللَّهِ

بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں
شمار ہوتے ہیں۔ انھیں نے سب سے پہلے اسلام میں اذان دی۔ جب
جماعت میں نظم پیدا ہو گیا تو نبی صلعم نے انھیں اذان پر متعین فرما دیا
تھا۔ بلاشبہ مہاجرین و انصار میں بہت سے لوگ بلند آواز تھے، اور
بلال سے زیادہ فصیح و بلیغ بھی تھے، مگر حق تعالیٰ جسے چاہے اپنے
فضل سے نوازے۔ اللہ کے رسول صلعم بلال کی اسلام میں سبقت
اور اذان میں اولیت سے خبردار تھے۔ لہذا جب تک یہ مدینہ میں مقیم رہتے
یہی اذان دیتے۔ جب یہ مدینہ سے باہر چلے جاتے تو ان کی جگہ ابو
مذورہ اذان دیتے تھے، اور اگر وہ لوں غیر موجود ہوتے تو پھر عمرو بن
ام مکتوم کے ذمے اذان ڈال دی جاتی تھی حضرت بلال ٹھیک و
پرا اذان دیتے تھے اور وقت کی پابندی کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ مجال
ہے جو مقررہ وقت سے اذان میں ذرا بھی دیر ہو جائے۔ اذان سے

فاریغ ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر آپ کو نماز کی اطلاع دینے کے لئے آکھڑے ہوتے اور بلند آواز سے فرماتے "حی علی الصلوٰۃ حی علی الفلاح الصلوٰۃ یا رسول اللہ نماز کے اور کامرانی کے لئے تشریف لائیے، اے اللہ کے رسول نماز کا وقت ہو گیا۔ پھر وہاں سے ایک طرف کو ہٹ کر وہیں کھڑے ہوئے آپ کا انتظار کرتے رہتے۔ جب اللہ کے رسول کو باہر تشریف لاتے دیکھتے تو تکبیر کہتی شروع کر دیتے تھے عید، بقر عید اور استسقاء کی نمازوں کے موقعہ پر بلال نیزہ لئے ہوئے آپ کے آگے آگے چلتے تھے۔ جب عید گاہ کے میدان میں پہنچ جاتے تو آپ کے سامنے نیزہ گاڑ دیا کرتے تھے۔ آپ اسی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے آپ کو بلال سے کمال محبت تھی اور ان کی بڑی عزت فرماتے تھے پھر آپ کی یہ خواہش رہتی کہ میری طرح دوسرے لوگ بھی بلال کو عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور میری طرح ان کی قدر و منزلت کریں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک عرب خاندان آپ کی خدمت مبارک میں حاضر ہوا اور ایک عربی خاندان کا نام لے کر آپ سے درخواست کرنے لگا کہ اس سے ہماری بیٹی بیاہ دیں "بلال سے شادی کیوں نہیں کر دیتے؟" آپ نے فرمایا اس روز وہ لوگ جو اب دیئے بغیر اٹھ کر چلے گئے۔ پھر دوسرے دن حاضر خدمت ہو کر کل والی درخواست دہرائی۔ آپ نے بھی

ہی کل والا جواب دہرا دیا آج بھی یہ لوگ جواب دئے بغیر واپس ہو گئے۔ تیسرے دن پھر حاضر خدمت ہو کر وہی درخواست دہرائی آپ نے وہی جواب لوٹا دیا جو پہلے دو بار لوٹا چکے تھے۔ اس دفعہ یہ کلمہ فرید فرمایا کہ تم ایک جنتی شخص سے کیوں نہیں بیاہ دیتے۔ آخر کار آپ کی بار بار سفارش سے ان لوگوں نے اپنی بیٹی حضرت بلال سے بیاہ دی۔ لوگوں کو خوب معلوم تھا کہ رسول اللہ صلعم مسلمانوں کے درمیان بجز باری سائی، عمل صالح اور نیک کاموں کے اور کسی اعتبار سے فرق روا نہیں رکھتے، لہذا بلال کی قدر و منزلت اسی طرح کی جاتی تھی جس طرح اللہ کے رسول چاہتے تھے۔ حضرت عمر فرمایا کرتے تھے، اَبُو بَكْرٍ سَيِّدُنَا وَ اَعْتَقَ سَيِّدَنَا، ابو بکر ہمارے سردار ہیں اور انھوں نے ہمارے سردار کو آزاد کیا ہے۔ حضرت عمر کا اشارہ حضرت بلال ہی کی طرف ہے یہ ایسی باتیں تھیں کہ ان سے بلال معرور و خود پسند ہو سکتے تھے لیکن کبر و نخوت ان کے پاس تک نہ پھٹکتا تھا بلکہ وہ ہمیشہ انکسار پسند اور متواضع ہی رہے ایک دفعہ آذان دے رہے تھے کہ دل میں کچھ بڑائی کا سا احساس پیدا ہوا فوراً چونک پڑے اور اس جذبے کی خدمت میں کچھ کلمے شعروں کے سانچے میں ڈھالنے چاہے مگر وہ نہ شر ہی رہی اور نہ نظم میں وزن تو بن گیا مگر قافیہ مفقود رہا:

مَا لِلْبَلَاءِ تَكَلُّهُ أُمَّةٌ وَابْتِلَاءٌ مِنْ تَضِحَ دَرَجَاتِهِ

بلال کو کیا ہو گیا اُس کی ماں اُسے روئے اور اس کی پیشانی نور کے پھینٹوں سے تر ہو جائے۔ مسلمان حضرت بلال کے پاس آتے

اور ان کی فضیلتیں اور خوبیاں بیان کرتے لیکن بلال صرف یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے۔ میں صرف ایک حبشی ہوں اور کل تک ایک غلام رہ چکا ہوں۔ فتح مکہ کے روز مسلمان مکہ میں ایک فاتحانہ شان سے

داخل ہوتے ہیں اور قریش طوعاً اور کرہاً مسلمان ہو جاتے ہیں۔

اللہ کے رسول صلعم مکتیوں کو یہ کہہ کر معاف فرمادیتے ہیں لَا تَتْرِبُ

عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ لِعَضِّ اللَّهِ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ (یوسف ۱۹)

آج تم پر کوئی الزام نہیں حق تعالیٰ تمہاری خطائیں معاف فرمائے وہ سب مہربانوں سے

زیادہ مہربان ہے۔) یہی بات حضرت یوسف نے اپنے بھائیوں سے فرما کر ان

کی خطائیں معاف فرمادی تھیں۔ پھر آپ بتوں کو توڑ کر اللہ کے مقدس گھر

کو شرک کی گندگی سے پاک و صاف فرماتے ہیں اور اس گھر کو خالص

حق تعالیٰ کے لئے مخصوص فرمادیتے ہیں۔ پھر بلالؓ سے فرماتے ہیں۔

”بلال کعبہ کی چھت پر پڑھ کر اذان دو۔“ اللہ کے رسولؐ نے مسکرا کر

فرمایا۔ آخر بلال کعبہ کی چھت پر اذان دیتے ہیں، عارت بن حشام

اور صفوان بن امیہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر آج میرا بھائی (ابو جہل)

میں حبشی غلام کو کعبہ کی چھت پر کھڑا دیکھ لیتا تو کیا حشر برپا کر دیتا؟
 مارت نے دل ہی دل میں کہا: "اگر میرے ابا جان اس غلام کو جسے
 انھوں نے مار مار کر سیدھا کیا تھا کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوا دیکھ لیتے
 تو قیامت کا ہنگامہ چارہ تے۔" صفوان نے آپ ہی آپ کہا۔ اگر ان
 کے بس کی بات ہوتی تو دل ہی دل میں کہتے پراکتفانہ کرتے، اور
 اندر ہی اندر نہ کڑھتے رہتے۔ لیکن بے بس ہیں، آنکھوں سے دیکھ
 ہے ہیں کہ کعبہ سے ان کے بت ہیل کو توڑ پھوڑ کر پھینک دیا گیا
 لات و عزیزی کی عزت لائیں مار مار کر خاک میں ملا دی گئی، اور منات
 کی توہین میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی، اور آج کعبہ کی چھت پر
 ایک حبشی غلام کھڑا ہوا ہے، اور توحید کی عظمت بھری صداؤں
 سے فضا گونج رہی ہے۔ یہ غلام آپ کے دین کا اس قوم میں بلند
 آواز سے اعلان کر رہا ہے جو محمد اور مسلمانوں کے خانی دشمن
 رہ چکی ہے۔ اور ان سے لڑائیاں بھی لڑ چکی ہے۔ مگر اب چارو
 ناچار مطیع ہو چکی ہے اور محمد کے دین کو قبول کر چکی ہے۔ یہ دونوں
 شخص بڑے ملال سے کعبہ پر حسرت بھری نگاہیں ڈال رہے تھے اور کعبہ
 کی چھت پر بلال کو دیکھ کر عدسے سے ان کی چھاتی پھٹی جا رہی تھی
 یہ دردناک نظارہ دیکھ کر ان سے نہ رہا گیا۔ دیکھا تم نے اس حبشی کو

کہاں کھڑا ہے۔ ایک نے حسرت بھری آواز میں اپنے ساتھی کے کان میں کہا: "اگر خدا کو یہ بات ناپسند ہوگی تو وہ یہ حالت بدل ڈالے گا۔" دوسرے نے آہستہ سے تلخ لہجے میں کہا: ادھر یہ دو آپس میں گفتگو میں مصروف ہیں اور ادھر بلال کعبہ کی چھت پر کھڑے ہوئے بلند آواز سے پکار رہے ہیں: - اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللهُ - اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللهِ - توحید کی دعوت بھلی پھولی اور پروان چڑھی۔ اسی طرح دن گزرتے گئے اور محمد صلعم کا کلمہ بلند و بالا ہوتا گیا۔ توحید کے نعروں سے فضا گونج اُٹھی اور اللہ کا کلمہ پوپا ہو کر رہا، کافی عرصے کے بعد ایک دفعہ نبی صلعم سے پھر طے کرنے کے بعد پھر حضرت بلال مسجد نبوی میں اذان دینے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں اور مسلمانوں کو اپنی بلند و خیریں آواز میں نماز کے لئے بلا لے رہے ہیں۔ مسلمان دلوں کو تھام کر اذان کا جواب دیتے ہیں جب حضرت بلال نے اٹک اٹک کر اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللهِ کہا تو مسلمان ناز و قطار رونے لگے، صحابہ کی روتے روتے پچکیاں بندھ گئیں اور ساری مسجد گونج گئی۔ جانتے ہو یہ کب کا واقعہ ہے؟ اس وقت واقعہ سے جب آپ کی روح ملا، اعلیٰ کو سدھار چکی تھی اور آپ کا جسد مبارک ابھی سپرد خاک نہیں کیا گیا تھا۔ پھر جب آپ کا جسد مبارک

پرو خاک کر دیا گیا اور ابو بکر کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کر لی گئی تو
 لال نے ان سے کھڑے ہو کر عرض کیا۔ اے خلیفہ رسول صلعم اگر آپ
 نے مجھے اپنے لئے خریدا ہے تو بیشک مجھے روک لیجئے اور اگر اللہ
 کے لئے خریدا ہے تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے۔ کیا چاہتے ہو بلال!
 حضرت ابو بکر نے فرمایا "میں نے اللہ کے رسول صلعم سے سنا ہے۔ آپ
 فرماتے تھے کہ انسان کا بہترین عمل خدا کی راہ میں جہاد کرنا ہے، لہذا
 آپ مجھے جہاد کے لئے جانے دیجئے۔" بلال نے جواب دیا۔ حضرت
 ابو بکر نے بلال کو اس ارادے سے باز رہنے کی ہر چند کوشش
 کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ ان سے اجازت حاصل کر کے حضرت
 بلال ملک شام چلے گئے اور وہاں پوری سرگرمی کے ساتھ مختلف
 معرکوں میں شریک ہوتے رہے۔ آخر کار سلمہ میں دمشق میں
 دار فانی سے کوچ کر کے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ سے
 ہزاروں سال نرگس اپنی بے لوری پہ روتی ہو
 بٹری مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ و پر پیدا

شہادت کی بشارت

حضرت عمارؓ بھی ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے آئے اور مبشر کے ہاں ٹھہرے۔ مہر کار رسالت نے خدیفہ سے ان کا بھائی چارا کرادیا تھا۔ یہ مبشر کے ہاں اس وقت تک سکونت پذیر رہے جب تک اللہ کے رسول نے انہیں مستقل سکونت کے لئے زمین کا ایک قوطہ مرحمت نہ فرمادیا۔ پھر آپ اپنا ذاتی مکان بنا کر اسی میں سکونت پذیر ہو گئے۔ رحمۃ للعالمین کو عمار سے بڑی محبت تھی، آپ ان پر بہت مہربان تھے، عمار کو بھی آپ کی اس محبت و شفقت کا احساس تھا جس کی بدولت وہ اسلام کی پابندی میں انتہائی سرگرم نظر آتے تھے اور اس پر مضبوطی سے قائم تھے۔ اسی خصوصیت کی بنا پر تمام مسلمانوں سے ممتاز تھے۔ مسلمانوں کی نگاہیں ان کی طرف فرمٹتی تھیں اور دل ان کے بارے میں غور و فکر کرنے پر مجبور تھے۔ اور کبھی کبھی آپس میں اس سلسلے میں تبادلہ خیالات بھی ہوتا تھا۔ عمارؓ

نام مسلمانوں کی نسبت خدا کی راہ میں زیادہ محنت و مشقت
 کے عادی تھے جب اللہ کے رسول نے مسجد نبیانی شروع کی اور عوام
 نے اس میں علی حصہ لیا کیونکہ وہ اس کام میں شرکت و تعاون کو
 اچھا جانتے تھے اور نیکی کا کام سمجھتے تھے رحمۃ للعالمین بھی عملی
 طور پر اس میں حصہ لے رہے تھے، اور آپ بھی مسلمانوں کے
 ساتھ ایک ایک اینٹ اٹھا کر لے جا رہے تھے یہاں تک کہ
 آپ کے رخ انور پر گرد پڑ جاتی اور جسم مبارک پر مٹی چھڑ جاتی۔ اس
 موقع پر تمام مسلمان تو ایک ایک اینٹ ڈھو کر لے جا رہے تھے،
 مگر عمار دو دو اینٹیں اٹھا کر لا رہے تھے اور اس میں بڑے گن
 اور خوش تھے۔ مسلمان تو دیکھ کر ششدر رہ جاتے اور منافق
 دل ہی دل میں جل بھن کر کباب بن جاتے۔ عمار اینٹیں ڈھو ڈھو کر
 لا رہے ہیں اور موج میں گنگنا رہے ہیں۔ *يَخْنُقُ الْمُسْلِمُونَ نَبِيَّيْهِ*
الْمَسَاحِدُ (مومن ہیں، مسجدیں بھی بناتے ہیں شوق سے) رحمۃ
 للعالمین ان کی گنگناہٹ سن کر فرماتے۔ *الْمَسَاحِدُ*۔ ہاں ہاں
 مسجدیں بناتے ہیں، کبھی رحمت عالم کو عمار پر ترس آ جاتا آپ کمال
 لطف و کریم اور بے حد شفقت و محبت سے ان کی طرف متوجہ
 ہوتے اور ان کے سر اور سینے سے خاک جھاڑتے۔ اسی طرح ایک

دن آپ نے عمار کے سینے سے مٹی جھاڑ کر فرمایا، سنتے ہو، عمار
 تمہیں باغی جماعت قتل کر ڈالے گی مسلمانوں کے دلوں پر آپ کی
 یہ بات پتھر کی لکیری طرح کھد گئی اور عمار کی عظمت و عزت کا
 ان پر کافی اثر پڑا۔ آپ نے یہ افسوسناک پیشین گوئی عمار سے نہ
 صرف ایک دفعہ بلکہ بار بار فرمائی تھی۔ مسجد بناتے وقت بھی آپ نے
 یہی جملہ فرمایا تھا۔ اور چند سال بعد خندق کھودے جانے کے موقع
 پر بھی آپ نے جلدیہ ترحم سے مجبور ہو کر عمار سے یہی جملہ فرمایا تھا
 اس موقع پر بھی عمار دیگر مسلمانوں کی بہ نسبت دہری محنت و مشقت
 کر رہے تھے۔ آپ اور صحابہ سب خندق کھودنے میں مصروف تھے
 آپ بھی پتھر اور مٹی ڈھور رہے تھے اور یہ شعر گنگناتے جاتے تھے،
 لَا هَمَّ إِلَّا الْعَيْشُ عَيْشُ الْآخِرَةِ
 فَانْفِرِ الْإِنصَارَ وَالْمُهَاجِرَةَ
 (بے فکر ہو درحقیقت عیشِ آخرت ہی کل ہے، اے اللہ انصار و مہاجر
 کو بخش دے) ابھی خندق کھودنے اور ملیہ اٹھانے میں مصروف
 تھے کہ کسی نے آکر کہا بیچارے عمار پر دیوار گر گئی اور وہ دب کر مر گئے
 آپ نے فرمایا، ہرگز نہیں، یہ بات ناممکن ہے۔ پھر آپ نے عمار کو تلاش
 کر کے ان سے ملاقات کی اور فرمایا۔ یاد رکھو عمار تمہیں باغی جماعت

قتل کر ڈالے گی۔ آپ کی یہ پیشین سُن کر عمار کے ایمان و یقین میں اور بھی اضافہ ہوا اور نیک عمل کرنے کا جذبہ بھڑک اُٹھا۔ یہی کرنے اور بدی سے بچنے کا جذبہ دم بہ دم بڑھتا ہی چلا گیا۔ عمار ایک خاموش طبع انسان تھے۔ بلا ضرورت بات نہیں کرتے تھے۔ اور بسا اوقات یہ الفاظ زبان پر لاتے، فتنہ و فساد سے خدا کی پناہ لے لے اللہ فتنوں سے محفوظ رکھنا۔ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے۔ اسلام لانے کے بعد ایک دن حضرت خالد ان کے پاس آئے۔ دونوں میں کچھ نزاع پیدا ہو گیا تھا۔ خالد عمار کو سخت سست کہتے ہیں۔ انہوں نے اس طرح گفتگو کی جس سے خدمت کا پہلو نکلتا تھا کہ سمیٹ میرے چچا ابو خدیفہ کی باندی تھی یا امران کا حلیف تھا یعنی یہ بتایا کہ عمار ان کے چچا ابو خدیفہ کا آزاد کیا ہوا ایک غلام ہے۔ بات یہ تھی کہ خالد میں اب تک مخزومیوں کی تعلق اور قریشیوں کا گھمنڈ موجود تھا۔ عمار نے رحمۃ للعالمین کے پاس آ کر خالد کی باتوں کو دہرا دیا۔ اتنے میں خالد بھی آپہنچے اور عمار سے اسی طرح تند و تلخ لہجے میں باتیں کرنے لگے۔ عمار نے ایک بات کا بھی جواب نہیں دیا۔ اللہ کے رسول خاموش سر جھکائے بیٹھے تھے۔ آپ نے سر اٹھا کر نہایت نرمی اور شیرینی سے دل بجانے والی آواز میں فرمایا: "عمار سے دشمنی مجھ سے دشمنی ہے۔" عمار

خوشی خوشی اٹھ کھڑے ہوئے البتہ خالد افسردہ رنجیدہ اور دل گیر ہو کر
 اٹھے اور اس وقت انھیں چین نہیں آیا جب تک عمار کو منانہ لیا اور
 انھیں یہ یقین نہ ہو گیا کہ عمار نے ان کی خطا معاف کر دی ہے۔



ارتداد کا فتنہ

رحمۃ للعالمین کی وفات حسرت آیات کے بعد عرب مرتد ہو گیا
 صدیق اکبر اور آپ کے ساتھ ہاجرین و انصار نے انھیں اسلام میں
 واپس لانے کی انتہائی کوشش کی چار و ناچار انھیں اسلام قبول
 کرنا ہی پڑا۔ اسی سلسلے میں خالد بن ولید صدیق اکبر کے حکم سے مسلمانوں
 کا ایک لشکر جرار لے کر مسیلہ کی تر کوئی کے لئے پیامہ روانہ ہوئے
 اور بنی حنیفہ کو شکست فاش دی۔ اس لڑائی میں مسیلہ مارا گیا۔ اس
 لشکر جرار میں ایسے افراد موجود تھے جو نہ صرف بدر و احد بلکہ تمام
 لڑائیوں میں اللہ کے رسول کے ساتھ ساتھ شریک رہے۔ عمار
 بن یاسر، ابو خدیجہ بن عتبہ، سالم بن سالم، اور عبد اللہ بن سہیل لڑائی
 کا پانسہ پلٹنے ہی کو تھا اور مسلمانوں کو ہزیمت ہونا ہی چاہتی تھی
 مگر لوگوں نے دیکھا کہ یہ چاروں حضرات پہاڑ کی طرح اپنی اپنی جگہ

پر جھے ہوئے ہیں اور بیٹنے کا نام نہیں لیتے۔ آخر کار سالم نے لوگوں سے پکار کر کہا۔ برادران اسلام! رسول اللہ صلعم کے ساتھ ہم اس طرح جنگ نہیں کیا کرتے تھے۔ پھر ایک گڑھا کھود کر اس میں پاؤں گاڑ کر اور جم کر کھڑے ہو گئے۔ ابو خذیفہ اور عبداللہ بھی سالم کی طرح گڑھا کھود کر اس میں پاؤں جما کر کھڑے ہو گئے اور قینوں دشمنان اسلام سے لڑتے لڑتے اپنی اپنی جگہ پر شہید ہو گئے۔ لوگوں نے دیکھا ہمارا ایک چٹان پر کھڑے ہیں، ان کا ایک کان کٹ کر نیچے گرا ہوا پھٹک رہا ہے۔ لیکن وہ کمال بے فکری اور انتہائی اطمینان سے لوگوں کو پکار رہے ہیں۔ مسلمانو! آؤ، میرے پاس آ جاؤ میں عمار ہوں یا سر کا بیٹا، ارے جنت سے بھاگ رہے ہو؟ وہ برابر اسی طرح مسلمانوں کو آوازیں دیتے رہے اور مسلمان دور دور کر ان کے پاس جمع ہوتے رہے، اور پھر سب نے ایک آخری اور فیصلہ کن حملہ کیا۔ حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی۔ صدیق اکبر کو حضرت سالم کی شہادت کی خبر ملی، آپ نے ان کا ترکہ بیتہ کے پاس بھیجا جنہوں نے ان کو آزاد کیا تھا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر واپس فرما دیا کہ میں نے تو مرحوم کو اللہ ہی کے لئے آزاد کیا تھا، مجھے مال کا قطعی لالچ نہ تھا۔ فاروق اعظم نے اپنے دور حکومت میں بیتہ کو پھر سالم

کا ترک دینا چاہا لیکن پھر انہوں نے وہی الفاظ کہہ کر لوٹا دیا جو صدیق
 اکبر سے کہے تھے۔ آخر کار ان کا ترک بیت المال میں رکھ لیا گیا۔
 صدیق اکبر اپنے عہد خلافت میں حج کے ارادے سے مکہ معظمہ
 روانہ ہوئے۔ جب شہر میں تشریف لے آئے تو آپ کی خدمت
 گرامی میں سہیل نے آ کر سلام کیا، آپ نے ان کے بڑے صاحبزادے
 عبداللہ کی تعزیت فرمائی جو جنگ یمامہ میں شہید ہو گئے تھے۔
 سہیل نے بڑی جرأت اور صبر کے ساتھ عرض کیا کہ اللہ کے
 رسولؐ نے فرمایا ہے۔ شہید اپنے خاندان کے ستر افراد کی
 سفارش کرے گا۔ مجھے قوی امید ہے کہ میرا بیٹا سب سے
 پہلے میری ہی سفارش کرے گا۔

فاروق اعظم کا دورِ خلافت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر کے بعد جب فاروق اعظم نے زمامِ قیادت اپنے ہاتھ میں سنبھالی تو انھیں ان فتوحات میں مشغول ہونا پڑا جس کی ابتداء یہ دونوں حضرات کر چکے تھے۔ آپ جنگی مہمات میں کمال سرگرم نظر آتے ہیں اور سستی یا کمزوری کا اظہار نہیں ہونے دیتے۔ نہ کسی شخص کو سست یا کمزور دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ نے اس دور کی مہذب و تمدن دینا پر عرب کا سکہ بٹھا دیا اور اپنی بے پناہ طاقت کا سلاطینِ عالم سے لوہا منوالیا۔ اس زمانے کی صدیوں کی منظم حکومتوں پر عرب کی بے مثال دھاک بٹھا دی۔ اس زمانے کی دنیا آپ کے مقابلے پر ٹھہر ہی نہ سکی، اور بڑی سے بڑی جٹی ہوئی سلطنتوں کی بنیادیں بل گئیں، رفتہ رفتہ سب عرب کے مطیع ہو گئے اور کسی کو ان کی

قیادت و سعادت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہ رہا۔ فاروق اعظم کا
 عہدِ زریں جنگی مہمات سے بھرپور ہے۔ ان ایام میں نہ تو آپ
 خود ہی سوتے تھے اور نہ کسی کو سونے دیتے تھے۔ ہر دم جاگتے رہتے
 اور دوسروں کو بھی ہوشیار و چوکنہ رکھتے۔ آپ بھی خلافت کے
 کاموں میں مصروف رہتے اور لوگوں کو بھی مصروف رکھتے۔ آپ
 ہی نے اپنے عہدِ مبارک میں عوام بادیہ نشین عرب اور قریش کے
 ان مخصوص افراد کے لئے جو آخر میں اسلام لائے تھے۔ جہاد
 کے دروازے کھول دئے اور تمام عرب میں اعلان کرا دیا کہ جس
 نے سرکارِ رسالت کی معیت میں رہ کر جہاد نہیں کیا اور جہاد کے
 ثواب سے اب تک محروم ہے اس کے لئے روم و فارس سے جہاد
 کرنے کے اور ثواب لوٹنے کے کافی مواقع حاصل ہیں۔ اگر وہ چاہے
 تو اپنا جو ہر مردانگی اور زور و شجاعت دکھا کر جہاد کا ثواب سمیٹ
 سکتا ہے۔ جہاد کے لئے کسی عمر کی شرط نہیں، انسان جوانی، نوجوانی
 اور بڑھاپے میں اپنی عمر کے ہر حصے میں جہاد کر کے حق تعالیٰ کے
 وعدے کو سچا کر دکھانے کی اہلیت رکھتا ہے، اس سے بڑھکر اور
 کیا سعادت ہوگی کہ انسان اپنی عمر کے ہر حصے میں اور ہر وقت خدا
 کا وعدہ سچا ثابت کرنے میں سرگرم و کوشاں ہو، اور اس کے قول کو

سچا کر دکھائے۔

وَعَدُّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا
اَسْتَخْلَفَ الدِّيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ
لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِيْ اَرْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ
مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اٰمَنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يَشْرِكُوْنَ
بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○

حق تعالیٰ نے مومنیوں اور نیک عمل کرنے والوں سے وعدہ فرمایا
سے کہ یقیناً وہ انہیں دنیا کی حکومت عطا فرمائے گا، جیسے پہلے
مومنیوں کو عطا فرمائی تھی، اور جو دین ان کے لئے پسند فرمایا ہے بلاشبہ
اس پر جمائے گا اور یقیناً انہیں خوف کے بعد امن عطا فرمائے گا، وہ اسی
کی عبادت کرتے ہیں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرنے۔
فاروق اعظم نے جب عرب کو جہاد کے لئے روانہ فرمایا تو وہ ایک
زبردست سیلاب کی طرح پھوٹ پڑے جو نہ کسی طاقت سے رکتے تھے
اور نہ کسی صورت سے بند ہوتے تھے۔ جب بند لڑٹ جاتے تو اس کا
رود کتا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ عرب کے اس سیلاب عظیم کے سامنے ہر مشکل

پانی تھی، ہر دشواری پر وہ غالب تھے، ہر سختی کو عبور کر چکے تھے، اپنی
 راہ سے ہٹاؤ بھی ہٹا دیتے تھے کسی کو حائل نہ ہونے دیتے تھے، اور
 کسی کی فراحت برداشت نہ کرتے تھے۔ روم و فارس کی مہموں کو سر
 کرنے میں ان نئے مجاہدوں سے صحابہ کرام بھی کچھ کم نہ تھے۔ خصوصاً وہ
 حضرات جو آپ کے ساتھ رہ کر لڑائی میں شریک رہے، ان مسلمانوں سے
 ہرگز کم نہ تھے۔ فاروق اعظم ان لوگوں کو غزوات میں شریک ہونے
 دیتے تھے، البتہ قریشی اکابر کو آپ بیرون ملک جنگ کرنے کے لئے
 نہیں جانے دیتے تھے اور مدینے ہی میں روک لیتے تھے۔ کیونکہ ان
 کے عوام سے آپ کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں یہ سردار لوگوں کو ستانے نہ لگیں
 یا وہ لوگ انھیں اپنا حاکم یا سردار نہ سمجھنے لگیں اور خواص سے فتنے
 کا اندیشہ تھا، یہ شرفائے قریش جب کسی غزوے میں جانے کی آپ سے
 اجازت مانگتے تو آپ یہ فرما کر انھیں روک دیتے تھے، تم اللہ کے
 رسول کے ہمراہ کافی جہاد کر چکے ہو اب آرام کرو۔ مگر غزوات قریش کی
 طرف سے یا قریشیوں کی طرف سے انھیں کوئی اندیشہ نہ تھا، اس
 لئے آپ بلا تامل انھیں جہاد کے لئے اجازت دیدیتے تھے تاکہ وہ جہاد
 کا جتنا ثواب چاہیں حاصل کریں یہی وجہ ہے کہ آپ نے حضرت بلالؓ
 کو حضرت ابوذرؓ کو، اور حضرت ابن مسعودؓ کو نہیں روکا۔

اور انھیں جہاد کے لئے بخوشی جانے دیا، کوئی شام گیا اور کوئی عراق
 اب مدینے میں کمزور و بیمار رہ گئے تھے یا وہ لوگ رہ گئے تھے جن کو
 فاروق اعظم کی پالیسی نے نہیں نکلنے دیا تھا، ایک دن جناب بن ارت
 نے سلام کے بعد آپ سے عراقی لشکر میں شامل ہونے کی اجازت مانگی۔
 آپ خوش ہوئے، انھیں اپنے پاس بلایا اور اپنی گدی پر بٹھا کر فرمانے
 لگے۔ آج روئے زمین پر بجز ایک شخص کے تم سے زیادہ کوئی اس گدی
 کا مستحق نہیں۔ امیر المؤمنین وہ شخص کون ہے؟ جناب نے پوچھا۔
 "بلال یا عمار" آپ نے فرمایا: امیر المؤمنین! وہ مجھ سے زیادہ حقدار
 کیسے ہو سکتے ہیں۔ قریش میں ان کے حمایتی موجود تھے لیکن میرا
 کوئی حمایتی نہ تھا۔ ایک روز غنڈوں نے مجھے پکڑ کر دہکتے ہوئے
 انگاروں پر چاروں خانے چت لٹا دیا اور ایک غنڈے نے اپنے
 پاؤں سے میرا سینہ دبائے رکھا تاکہ میں جل نہ سکوں۔ خدا
 کی قسم وہ دہکتے ہوئے انگارے میری پیٹھ ہی سے مجھے جناب نے
 فاروق اعظم کو اپنی پیٹھ سے چادر سر کا کر وہ نشانات دکھائے جو انگاروں
 سے جل کر پڑ گئے تھے۔ حاضرین نشانات دیکھا کہ سہم گئے۔ ان کی پیٹھ
 برص کے داغوں کی طرح جل کر سفید ہو گئی تھی۔ اس آزمائش و امتلا
 نے انھیں اللہ کے رسول کے ساتھ بدر، اُحد اور خندق میں شریک

ہونے سے نہ روکا، اور آپ برابر ہر جنگ میں شریک ہوتے رہے۔
مطلب یہ ہے کہ ان سخت سے سخت آزمائشوں اور تکالیف و مصائب
کے باوجود جو وہ اسلام کی خاطر قدم قدم پر برداشت کر رہے تھے، یہی سمجھ
رہے تھے کہ وہ ابھی تک اپنے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہوئے اور وہ
تکالیف و مشقتیں اور وہ قربانیاں جو دین کے لئے ضروری ہیں اور اس
کے رسول کو مطلوب ہیں ابھی باقی ہیں، اسی خیال کو لے کر وہ عراق پہنچے
اور وہاں جہاد کرتے رہے۔ پھر کوفہ میں سکونت پذیر ہو گئے چونکہ
کافی عمر تھی اسی وجہ سے طرح طرح کے دکھوں نے آگھرا۔ جب بیماری
نے پوری شدت سے حملہ کیا تو چند صحابی آپ کی بیماری پر سی کے لئے آئے
جگہ جگہ پیٹ پر سات داغ لگوائے تھے جن کی بھید جلن اور سوزش محسوس
ہو رہی تھی۔ آنے والے صحابیوں نے انھیں کمال خوف زدہ اور گھرایا ہوا
دیکھا اور پھرے سے رنج و غم اور خوف و گھبراہٹ کے آثار مترشح دیکھے
آنے والوں سے کہنے لگے اگر رسول اللہ صلعم نے موت کی تمنا کرنے
سے منع نہ فرمایا ہوتا تو میں اس وقت موت کا آندہ مند ہوتا۔ پھر آواز
بند ہو گئی جسم ٹھنڈا پڑ گیا اور رخساروں پر آنسو بہنے لگے۔ بیماری پر سی
کرنے والوں نے انہیں تسکین و تسفی دی اور کہنے لگے، ابو عبد اللہ اس
وقت تم کو مسرت کا اظہار کرنا چاہئے کہ تم اپنے فلاں فلاں بھائیوں سے

ملاقات کرو گے، یہ سن کر اور زار زار رونے لگے اور روتے روتے
 بچکیاں بندھ گئیں۔ جب روتے روتے دل کا غبار صاف ہوا تو
 آہستہ سے ٹوٹی پھوٹی آواز میں فرمایا۔ میں گھبراہٹ یا خدا نخواستہ
 بے صبری سے نہیں رو رہا ہوں بلکہ تم نے جو ان چند لوگوں کا ذکر کیا
 جن کو تم نے میرا بھائی بتایا وہ سب اپنا اپنا اجر و ثواب لیکر سدھار گئے
 تم نے میرے جن نیک عملوں کا ذکر کیا ہے ہائے مجھے تو یہ فکر کھائے
 جا رہا ہے کہ میں ان کا ثواب مجھے ان کے بعد دنیا ہی میں نہ مل گیا ہو
 اور یہ نعمتیں اور یہ عیش و آرام انھیں اعمال کا صلہ نہ ہوں۔ یہ فرما کر
 بے ہوش ہو گئے زبان بند ہو گئی۔ دیکھنے والوں نے سمجھا مر گئے
 یا عنقریب مرنے والے ہیں لیکن ابھی کچھ ساتیس باقی تھیں۔ قدرے
 ہوش آیا اور افاقہ محسوس ہونے لگا، ادھر ادھر دیکھا تو سامنے کتان
 کا کفن موجود تھا، اُسے دیکھ کر رونے لگے اور فرمایا، کیا پوچھتے ہو آہ
 نبی صلعم کے چچا غزہ کو چھوٹی سی چادر ہی میسرا آئی تھی اور اتنی چھوٹی
 تھی کہ اگر سر ڈھکا جاتا تھا تو پاؤں کھل جلتے تھے اور اگر پاؤں ڈھکے
 جاتے تھے تو سر کھل جاتا تھا، آخر سر ڈھک دیا گیا اور پاؤں پر اذخر
 ڈال دی گئی۔ رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک میں میں بالکل تلاش و مفلس
 تھا۔ میرے پاس ایک کوڑی بھی نہ تھی۔ لیکن آج گھر کے اس کوٹے میں اس

صندوقچی میں چھ ہزار چھ سو چھ ^{۶۶۶۶} نقد موجود ہیں، مجھے تو پڑا فخر لگا ہوا ہے کہ کہیں ہمیں آخری نعمتیں آخرت سے پہلے پہلے دنیا ہی میں نہ دیدی گئی ہوں۔" ملاحظہ کیا جناب کو انھوں نے اللہ کی راہ میں کیسی کیسی مصیبتیں جھیلی ہیں، کتنی کتنی کڑی آزمائشوں سے گزرے ہیں اور ان پر کیسے کیسے نازک موقعے آئے ہیں، پھر کیسے کیسے نیک عمل کئے ہیں لیکن پھر بھی لہر رہے ہیں، ڈر رہے ہیں، اور رو رہے ہیں کہ کہیں رب العالمین کے پاس خالی ہاتھ تو نہیں جا رہا۔ کہیں نیک عملوں کا صلہ دنیا میں تو نہیں مل گیا اور آخرت کے لئے خالی ہاتھ تو نہیں رہ گیا۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا: "ان کا اندیشہ بجائے، بھول گئے اللہ کے رسول نے اس عورت سے کیا فرمایا تھا جس نے عثمان بن مظعون کی موت کے بعد یہ کہہ دیا تھا کہ خدا نے ان پر رحم فرمایا اور اپنی عنایتوں سے نواز دیا آپ نے پوچھا کہ یہ بات کیونکر معلوم ہوئی کہ حق تعالیٰ نے انھیں عزت عطا فرمائی، اور بخششوں سے نوازنا حالانکہ مجھے بھی نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا ہوگا باوجودیکہ میں اللہ کا رسول ہوں۔" دوسرے نے جواب دیا۔ اس ہولناک بیماری کی تکلیف، غم و اندوہ کی فراوانی اور خشیتِ الہی آخری وقت میں کوئی بھی پیر جناب کو مسلمانوں کی ہمدردی، نصیحت اور تعلیم سے نہیں روکتی۔ اس زمانے میں لوگوں کا دستور تھا کہ وہ اپنے

غزیزوں کو اپنے گھروں کے قریب اپنے اپنے قبرستانوں میں دفن
 کیا کرتے تھے۔ جب جنابؑ کو اپنی موت کا احساس ہوا تو اپنے صحابہؓ
 سے فرمانے لگے: "بیٹا مجھے شہر سے باہر دفن کرنا کیونکہ جب لوگ
 دیکھیں گے کہ اللہ کے رسول کے ایک صحابی کونے سے باہر دفن ہیں
 تو وہ اپنے مردوں کو بھی شہر سے باہر دفن کرنے لگیں گے۔ حضرت
 جناب کا انتقال ہو گیا، آپ کے جنازے کی نماز حضرت علیؓ نے پڑھائی
 پھر شہر کے باہر حسب وصیت دفن کر دئے گئے۔ ان کے بعد لوگوں نے
 اپنے اپنے غزیرا آپ کی قبر کے چاروں طرف دفن کرنے شروع کر دیئے۔

صہیبؓ رومی کی امامت

صہیب اسلام لانے کے بعد اپنی قدیم عادت کے مطابق جو دو کرم اور خیر خیرات کرتے رہے۔ فتوحات کے بعد ان کا مال روز بروز بڑھتا ہی گیا، اور ساتھ ہی ان کی سخاوت و فیاضی میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ آخر ان کی دریا دلی لوگوں میں مشہور ہو گئی، روزانہ بے شمار لوگ ان کے دسترخوان پر سیر ہو کر کھانا کھاتے تھے، ان کی فیاضانہ طبیعت اور غیر معمولی داد و دہش نے انہیں لوگوں میں ہر دل عزیز بنا دیا اور ان کی خیر خیرات کے لوگوں میں خوب چرچے ہونے لگے۔ حضرت عمرؓ نے بھی جگہ جگہ ابو بھئی کی تعریف سنی اور ان کی سخاوت و دریا دلی کے واقعات لوگوں سے سنے

فاروقؓ اعظم نے تعجب سے پوچھا: یہ ابو بھئی کون ہیں، جن کا لوگوں میں ذکر خیر رہتا ہے؟۔ لوگوں نے مسکرا کر جواب دیا:۔ امیر المؤمنین!

یہ صہیب رومی ہیں۔ فاروق اعظم نے پوچھا: "اچھا صہیب ہیں تم؟"
 اللہ کرے زورِ کرم اور زیادہ۔" کیا صہیب کے صاحبزادے کا نام بھلی ہے؟
 لوگوں نے جواب دیا: "ان کی کنیت ابو بھلی ہے، اپنی قوم کے
 فیاض لوگوں کی طرح اپنی دریا دلی اور خیر خیرات میں مشہور ہیں۔"
 فاروق اعظم نے پوچھا: "کیا صہیب عربی ہیں؟"
 لوگوں نے جواب دیا: "ہاں کہتے تو یہی ہیں۔"

آخر کار فاروق اعظم خاموش ہو گئے اور کچھ نہ بولے۔ ایک
 روز فاروق اعظم مسجد میں تشریف فرماتے تھے اور لوگوں نے آپ کو چاروں
 طرف سے گھیر رکھا تھا، ان لوگوں میں صہیب رومی بھی تھے۔ آپ نے
 انہیں دیکھا کہ اپنے پاس بلا کر پوچھا:

"تمہارا کوئی بچہ تو ہے نہیں جس کا نام بھلی ہو، پھر تم نے ابو بھلی
 کنیت کیوں رکھ چھوڑی ہے؟ تم کہتے ہو کہ میں عربی ہوں حالانکہ تم
 رومی ہو اور تم اس قدر کیوں دیتے دلاتے اور کھلاتے پلاتے ہو جس
 سے اصراف کا اندیشہ پیدا ہوتا ہو؟"

صہیب نے جواب دیا: "اللہ کے رسولؐ فداہ ابی و امی نے میری
 کنیت ابو بھلی تجویز فرمائی، درحقیقت میں نمبرن قاسط کا آدمی ہوں جو
 موصل کے باشندے تھے لیکن مجھے چھٹینے میں اغوا کر لیا گیا تھا اس

وقت مجھے اتنا ہوش تھا کہ میں اپنے گھر کے افراد کو اپنی قوم کو اور اپنے نسب کو خوب جانتا تھا، رہا اصراف کا شبہ تو اس کا یہ جواب ہے کہ رسول اللہ صلعم فرماتے تھے: **إِنَّ خَيْرَ كَرْمٍ مَنْ أَطْعَمَ الطَّعَامَ وَرَدَّ السَّلَامَ** تم میں وہ شخص بہتر ہے جو کھانا کھلائے اور سلام کا جواب دے۔ اس حدیث نے مجھے کھانا کھلانے کی رغبت دلائی۔ یہ سن کر فاروق اعظم خاموش ہو گئے۔

صہیب رومی جب تک زندہ رہے ایک ایسے بچے سے مسلمان کی طرح زندگی گزارتے رہے جس کا نقشہ اللہ کے رسول نے اپنی اس حدیث میں کھینچ کر بتایا: **أَمْسَلِمَ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَرِيدَ كَلِمَةَ الْمُسْلِمَانِ** وہ ہے جس کی زبان اور لہجہ تم سے مسلمانانہ ہے (خوت رہیں) صہیب کی ذات ستودہ صفات سے خدا کی مخلوق کو فیض ہی پہنچتا رہا، اور تو علم کا دریا بہہ رہا تھا اور ادھر بھر کرم میں نہ دھرتا رہتا تھا، نہ علم کے موتی لٹانے میں کنجوس تھے اور نہ سونے چاندی کے سکے بہانے میں بخیل واقع ہوئے تھے۔ البتہ ایک بات میں وہ خردورس ضرور تھے، جس میں وہ صحابہ کے طرز عمل کا لحاظ رکھتے تھے، غلطی کے اندیشہ سے روایتیں بہت کم بیان کرتے تھے۔ ہاں لوگوں سے فرمایا کرتے تھے، آؤ میں تمہیں ٹرائیوں کے واقعات

سناؤں قال رسول اللہ صلعم میرے بس کی بات نہیں۔ عہد صدیقی اور
 عہد فاروقی میں صہیبؓ ایک دریا دل اور قیاض طبع مہاجر کی طرح زندگی
 بسر کرتے رہے۔ آخر ایک دن ایک نازک اور دل دوز حادثہ پیش آگیا
 جس سے مسلمانوں کو کمال صدمہ ہوا۔ فاروق اعظم کو ایک سر پلرے آدمی
 نے جسے ابو لؤلؤ کہتے تھے زخمی کر دیا۔ اس وقت فاروق اعظم نے
 ایک مجلس شوریٰ کا انتخاب فرمایا اور یہ وصیت فرمائی کہ میں دن ایک
 صہیب مسلمانوں کو نماز پڑھائیں گے اور جب تک اراکین شوریٰ
 کوئی امام نہ چن لیں گے۔ صہیب امامت کے فرائض انجام دیں گے۔
 سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ صہیب رومی ان ایام میں امامت
 کے فرائض حسن و خوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ آپ نے فاروق
 اعظم کے جنازے کی بھی لوگوں کے اصرار سے نماز پڑھائی کیونکہ اس
 وقت آپ ہی مسلمانوں کے امام تھے۔ جب تک اراکین شوریٰ نے اپنا
 امام منتخب نہ کر لیا، نہ کسی مہاجر نے ان کی امامت پر اعتراض کیا اور نہ
 کسی انصاری نے البتہ چند قریشی نوجوان آپس میں چرمیکو بیاں کہنے
 لگے۔ بد قسمتی سے یہ نوجوان فاروق اعظم سے بھی خوش نہ تھے اور نہ
 انھیں آپ کو عملی زندگی بھاتی تھی، کیونکہ آپ کا طرز عمل قریش کے مسا
 سخت تھا اور حق پر پڑی لے دے کرتے تھے۔

ایک شخص بولا " عمر کو دیکھتے نہیں، انہوں نے صہیب رومی کو مسلمانوں کا امام بنا دیا، حالانکہ یہ ایک قریشی شخص ہی کا غلام تھا: خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ امیر المؤمنین نے صہیب کو مجلس شوریٰ کے ختم تک ہی امام بنایا، ورنہ اگر وہ انہیں اپنا جانشین مقرر فرما جاتے تو ان سے یہ بات کوئی بعید نہ تھی۔"

دوسرا بولا: " بڑے افسوس کی بات ہے تم فاروق اعظم کی شان میں بدگمانی کر رہے ہو۔ حالانکہ بعض بدگمانیاں انسان کو گنہ گار بنا دیتی ہیں، بھلا وہ ایک ایسے معمولی شخص کو کیسے مسلمانوں کا امام بنا سکتے تھے جو کبھی عبداللہ بن جدعان کا غلام تھا اور جسے عرب یا رومی اغوا کر کے لے گئے تھے۔"

تیسرے نے جواب دیا: اچھا تم بھول گئے عمر نے ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر آج ابو عبیدہ زندہ ہوتے تو میں انہیں خلیفہ بنا دیتا۔ اگر ابو خدیفہ کا آنا دیکھا ہوا غلام سالم آج زندہ ہوتا تو زمام خلافت اسی کو سونپ دیتا۔ معلوم ہے یہ سالم کون تھے۔ یہ بھی اصطخر کے باشندے اور ایک فارسی غلام تھے۔ جب عمر ایک فارسی غلام کو خلافت دینے کے آزد و مند ہیں تو ایک رومی غلام کو خلافت دینے میں کونسی چیز حائل ہے؟ اس کے ایک ساتھی نے طنزیہ لہجے میں ٹھٹھا لگا کر کہا:

”کس قدر شرناک بات ہے کہ تم لوگ جاہلیت کی سی یا میں کر رہے ہو، کف ہے تم پر، مسلمان ہو یا منافق، حق تعالیٰ فاروق اعظم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے ہم نے انہیں ہمدرد و خیر خواہ اور مخلص و نیک ہی پایا۔ تم اس آیت کو بھول گئے؟“

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا
وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَهَكُمْ حِنْدَ اللَّهِ أَتَقْتُمْ اللَّهَ
عَلَيْمٌ خَبِيرٌ

لوگو ہم نے تمہیں ایک مرد و عورت سے پیدا کیا اور تمہارے چھوٹے بڑے خاندان بنا دیئے تاکہ تمہارا تعارف ہو۔ اللہ کے نزدیک وہی عزت والے ہیں جو پارسا ہیں، بلاشبہ اللہ خوب جانتے والا اور خوب خبردار ہے۔

ان میں سے ایک نے ناراض ہو کر کہا آخر یہ نوجوان منتشر ہو گئے۔ ہمیں سے کچھ تو راہ ہدایت پر گامزن تھے اور بعض اپنے دلوں میں یہ سمجھتے رہے کہ قیادت سیادت کا حق عرب ہی کا ہے کسی اور کا نہیں کسی کو یہ حق نہیں خواہ وہ عمر می کیوں ہوں کہ اس حق کو عرب سے اور خصوصاً قریش سے چھین کر فرانس روم کے باشندوں کو دیدیا جائے۔ ان نوجوانوں کے اور ان جیسے دیگر بہت سے لوگوں کے انداز فکر نے رفتہ رفتہ مسلمانوں کیلئے فتنہ و فساد کے دروازے کھول دیئے۔ عرفت فتنہ کا بند دروازہ تھے ان کی شہادت سے یہ بند دروازہ کھلا نہیں بلکہ ٹوٹ گیا اور فتنے اوپر تلے ٹوٹ پڑے۔

امارت و محکمہ جنگ

مسلمانوں کا حصہ پر قبضہ ہو گیا، ابن مسعود کافی عرصہ تک وہاں مقیم رہے اور مجاہدانہ زندگی بسر کرتے رہے۔ جو شش قسمتی سے ایک دن مدینہ کے مسلمانوں نے انھیں مسجد نبوی میں رونق افروز دیکھا، دوڑ کر ملنے آئے سلام و مصافحہ کیا اور خیر و عافیت پوچھنے کے بعد روڈ مسعود کا سبب پوچھا۔ آپ نے فرمایا مجھے کچھ خبر نہیں مجھے امیر المؤمنین نے طلب فرمایا تھا، ان سے ملنے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ فاروق اعظم نے انھیں تنہائی میں بلایا پھر عمار بن یاسر کو بلایا پھر عثمان بن حنیف کو بلایا، ان تینوں حضرات سے مل کر آپ نے نماز سے فارغ ہو کر یہ اعلان کر دیا کہ میں نے عمار بن یاسر کو کوفے کا وزیر امور مذہبی اور وزیر دفاع مقرر کیا اور کوفے کا وزیر تعلیم اور وزیر مال عبداللہ بن مسعود کو بتایا۔ اور کوفہ اور عراق کی پیمائش پر عثمان بن حنیف کا تقرر کیا۔ اسلام میں سبقت کرنے والے مہاجرین و انصاریوں نے فاروق اعظم کے اس اعلان کو سراوراً سبکدوشی پر جگدی اور اس انتخاب کو بہت کچھ سراہا لیکن اخیر میں اسلام لانے والے

عمر نے اور کیا کیا، یہی تو کیا تاکہ اللہ کے وعدے کو نافذ فرما دیا اور کمزوروں اور
 بے بسوں کو طاقتور بنا دیا۔ دوسرے شخص نے جواب دیا: "اچھا یہ بات ہے۔" پہلے
 شخص نے خوش ہو کر کہا۔ آخر تینوں حضرات سرکاری فرمان لے کر کوفے پہنچے۔ ان کے
 پہنچنے پر کوفے کے سرکردہ اصحاب مسجد میں جمع ہوئے اور ان کے سامنے حضرت عمر کا
 یہ سرکاری فرمان پڑھا گیا جس میں تحریر تھا: "اما بعد میں نے عمار کو امیر، ابن مسعود کو معلم
 و وزیر اور خزانے کا افسر مقرر کر کے بھیجا ہے یہ دونوں حضرات محمد رسول اللہ صلی
 اللہ علیہ وسلم کے ان معزز اصحاب میں سے ہیں جو جنگِ بدر میں شریک تھے، لہذا
 انکی بات مانو، انکی اطاعت کرو اور انکی پیروی میں کوئی کسر اٹھانا نہ رکھو۔ تمہیں
 معلوم ہونا چاہیے کہ میں ابن ام عبد کو تمہارے پاس بھیجا ایشار سے کام لے
 رہا ہوں، تم کو اپنی ذات پر ترجیح دے رہا ہوں اور عثمان کو عراق کی پیمائش
 سپرد کر کے بھیج رہا ہوں۔ ان حضرات کی تنخواہ ایک بکری روزانہ مقرر کی گئی
 ہے جس کا نصف حصہ اور شکم عمار کے لئے مخصوص ہوگا اور باقی ابن مسعود
 اور عثمان میں برابر تقسیم ہو جائیگا۔ جب کوئیوں نے یہ سرکاری حکم سنا تو سرا اور نکول
 پر جگہ دی اور حکام کے مطیع و منقاد بن کر رہے، ان حکام نے بھی انتہائی سرگرمی
 خوش اسلوبی اور محنت و مشقت سے سرکاری فرائض انجام دیئے۔ عمار بن یاسر
 جب غور کرتے ہیں تو اپنے کو اسلامی حکومت کے ایک بڑے حصہ کے حاکم اور ایک
 بڑے لشکر کے سپہ سالار پاتے ہیں۔ غالب خیال ہے کہ آج انہوں نے اپنے وہ

مصائب و تکالیف یاد کئے ہونگے جو انہوں نے مدینہ کی ہجرت سے قبل جھیلے تھے اور ان دشواریوں اور نراکتوں کا بھی احساس ہوا ہوگا جو ہجرت کے بعد اللہ کے نبی کے ساتھ برداشت کی تھیں لیکن ان خیالات و احساسات کا غالباً ان کے دل پر کچھ بھی اثر نہ ہوا ہوگا۔ کیونکہ انہیں اس بات کا پختہ یقین تھا کہ خدا کا وعدہ سچا ہے چنانچہ اسکی صداقت انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ اقتدار حکومت ہاتھ آنے کے بعد کسی قسم کا غرور و تکبر یا تعالیٰ اور خود پسندی ان میں پیدا نہیں ہوئی کیونکہ اکابر کی طرح یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ دنیوی زندگی دھوکہ کی ٹیٹھی ہے یہاں بڑے بڑے گروہ والوں کی آزمائش ہوتی ہے جو شخص غربت و آبرو کے ساتھ پاک دامن اور پارسا بن کر اس جھیل کو عبور کر گیا وہی آخرت میں کامران و بامراد ہے، اور جو عیش و عشرت، خواہشات کی تکمیل اور من مانی کارروائیوں کی دلدل میں پھنس گیا اسکے لئے آخرت میں ٹوٹا ہی ٹوٹا ہے، اسکی نیکیاں بھی رائیگاں گئیں، کوششیں بھی برباد ہوئیں اور اعمال بھی غارت ہوئے، انہیں دنیوی زندگی ہی میں ان کے نیک عملوں کا صلہ مل گیا اور آخرت میں قلاش و مفلس بن کر آئے ہماری ناقص لئے میں ابن مسعود کو بھی اپنی وہ فقیرانہ زندگی یاد آئی ہوگی جب وہ عقبہ کی بکریاں چرایا کرتے تھے، اور دنیا باوجود وسعت و فراخی کے ان پر تنگ ہوتی چلی جا رہی تھی، انہیں یہ بات بھی ضرور یاد آئی ہوگی کہ جب انہوں نے سرکار رسالت کو اور ان کے رفیق سفر کو عقبہ کی بکریوں کے دودھ سے منع کر دیا تھا تو آپ انکی امانت سے بڑے خوش ہوئے تھے۔ پھر

مسلمان ہونے کے بعد آپ نے انھیں اپنا ہمزاد اور خاص خاص دوست بنا لیا تھا انھیں یہ واقعہ بھی یاد آیا ہوگا کہ ایک روز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انکے بارے میں یہ فرمایا تھا کہ قیامت کے روز انکی پندلیاں میدان میں اُحد پہاڑ سے زیادہ وزنی ثابت ہونگی۔ ان تمام گذشتہ خیالات نے اُنکے اندر ایمان، ثابت قدمی، امانت کی محبت اور اُسکی نگہداشت میں اور اصفاء کہ دیا ہوگا۔ ایمان و یقین اور بڑھا دیا ہوگا۔ امانت کے جذبہ میں اور اصفاء ہوا ہوگا۔ پھر آپ ہمیشہ اپنے دوست کے مخلص و فادار اور اُمت کے ہمدرد و غمگسار بن کر زندگی بسر کرتے رہے۔ عمار کانی عرصے تک کوفہ کے امیر رہے۔ امارت کے زمانے میں بھی اُن کے دل میں وہی نرمی اور رواداری موجود تھی۔ معمولی عادتوں میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئی تھی، وہی پہلا سا سکوت، وہی کم سخن، وہی لوگوں سے گھلے ملے رہنے کی عادت وہی عدل و انصاف وہی بلا تکلف دینی ہمدردی اور وہی فاضلانہ اخلاق ان میں پائے جاتے تھے۔ ایک دن آپ سے ایک سوال کیا گیا جو لوگوں کی سمجھ سے بالاتر تھا، آپ نے فرمایا کیا ایسا واقعہ ہوا ہے۔ لوگوں نے جواب دیا نہیں فرمایا جب تک یہ بات پیش نہ آئے اُسے چھوڑے رکھو، جب اس سے سابقہ پڑے گا تو کوئی نہ کوئی حل تلاش کر ہی لیا جائیگا۔ امیر کوفہ عمار بن یاسر عوام کی طرح اپنے سودے سلف کے لئے خود بازار جاتے اور آپ سودا خرید کر بیٹھ پر لاد کر لے آتے،

بازار میں جسے دیکھتے اس سے سلام کر کے بات چیت کر لیتے، کونے کے امیر تھے مگر کسی کام میں ذرا عار نہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک درہم کی گھاس خریدنے میں، بیچنے والے سے رسی مانگتے ہیں وہ صاف انکار کر دیتا ہے آخر بڑی روڈ و قدح کے بعد ادھی رسی پر نزاع طے ہو جاتا ہے، پھر گھاس پشت پر لا کر اپنے گھر لے آتے ہیں، حالانکہ کونے کے امیر ہیں مگر گھاس لادنے میں ذرا عار نہیں فرماتے نہ انھیں اس بات کا خیال آتا ہے کہ اس ادنیٰ کام سے ان کی عزت گھٹ جائیگی اور ان کی قدر و منزلت میں ذرا فرق نہ آئے گا۔ اس زمانے کے لوگ بھی ان باتوں کو باعث عار نہیں جانتے تھے، اور نہ ان کے خیال میں امارت کے رتبے میں ان باتوں سے کوئی فرق آتا تھا۔ عمار مزاج کے بڑے حلیم اور بردبار تھے۔ اگر کوئی شخص ان کی دایات پر حملہ کرتا تو اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ لیکن اگر کوئی کسی دینی بات میں گڑبڑ کرتا یا سستی برتتا یا کسی کی حق تلفی کرتا تو بڑے ناراض ہوتے تھے اور حق والے کا حق دلالتے بغیر نہیں رہتے تھے۔ ایک دفعہ کسی حاسد نے حضرت عمر سے ان کی چلی کھائی۔ جب عمار نے یہ بات سنی تو صبر کیا اور بس اتنا فرمایا یا اللہ اگر اس نے میری جھوٹی شکایت کی ہے اور اس نے مجھ پر طوفان اٹھایا ہے تو اسے خوب فراخی عطا فرما اور اسے ایک مغرور سردار بنا کہ لوگ اس کے پیچھے پیچھے چلیں۔ ایک حاکم

وقیوں کا لشکر لے کر بصریوں کی مدد کے لئے پہنچے، اس جنگ میں
 قی تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی۔ اس وقت ایک بصری نے
 آپ کو اس گستاخانہ کلمے سے یاد کیا، اسے کہتے کٹے کیا تو بھی ہمارے ساتھ
 مالِ غنیمت میں شریک ہوگا۔ عمار نے ہنس کر صرف یہ بات فرمائی، افسوس
 لینے میرے خوش قسمت کان کو برا کہا۔ عمار کا ایک کان جنگِ یمامہ
 کے موقع پر اللہ کی راہ میں کٹ گیا تھا۔ بصری عمار کو اور ان کی ساتھ
 والی فوج کو مالِ غنیمت دینے سے انکار ہی کرتے رہے۔ لیکن یہ اپنا
 حق لینے پر ڈٹے رہے۔ آخر اس بارے میں حضرت عمر کو لکھا گیا۔ حضرت عمرؓ نے
 جواب میں لکھا کہ مالِ غنیمت ان تمام مجاہدوں کا حق ہے جو جنگ میں شریک
 رہے۔ آخر کار عمار نے اور ان کی فوج نے بصریوں سے اپنا حق لے کر ہی
 چھوڑا، حضرت عمرؓ کی عادت تھی کہ آپ صوبوں کے حکام کا تبادلہ
 فرماتے رہتے تھے۔ کسی صوبے کی عمارت طویل عرصے تک کسی ایک
 امیر کے پاس نہیں رہنے دیتے تھے۔ اسی پالیسی کے ماتحت آپ
 نے تھوڑے عرصے کے بعد عمار کو بھی معزول فرما دیا۔ جب عمار سے

مدینہ میں ملاقات ہوئی تو فرماتے لگے :-

عمرؓ: "ہمارے معزول کرنے سے تم ناراض تو نہیں ہوئے؟"

عمارؓ: "جب آپ نے پوچھا ہی ہے تو جب آپ نے مجھے حاکم بنایا تھا

اس وقت میں کونسا خوش تھا، نہ اب معزولی پر خوش ہوں، معزولی کے بعد حضرت عمار نے حضرت عمر کے آخری عہدِ خلافت میں، اور حضرت عثمان کے دورِ خلافت میں، عبادت، اطاعت، وعظ و نصیحت اور لوگوں کی اصلاح پر اپنی زندگی وقف کر دی۔

ایک دن عمار کو یہ معلوم ہوا کہ حضرت عثمان نے عبداللہ بن ابی سرح کو مصر کا امیر بنا دیا ہے۔ یہ خبر سن کر بڑے بے چین و بے قرار ہوئے اور ان کے دل کو زبردست ٹھیس لگی۔ اس وقت انہیں ایک بات یاد آئی جس کو دل ہی میں پوشیدہ رکھا زبان پر نہ آنے دیا۔

یاد آیا کہ ایک دفعہ قرآن پاک کی یہ آیت اتری تھی:

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۙ اِلَّا مَنۡ اُكْرِهٖۙ وَ
 قَلْبُهٗ مُطْمَئِنُّۙ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنۡ سَخَّ بِالْكَفْرِ
 صَدْرًاۙ فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنۡ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌۙ

”جو شخص ایمان لا کر کافر ہو گیا علاوہ اس کے جس پر جبر کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان سے مطمئن ہو لیکن جس کے دل میں کفر اتر آیا اس پر اللہ کا غضب ہے اور بڑا بھاری عذاب ہے۔“

اس آیت میں ان کی طرف اور عبداللہ بن ابی سرح کی طرف اشارہ ہے جس کو آج مصر کا حاکم بنا دیا گیا ہے۔ مسلمان جانتے تھے کہ عبداللہ بن ابی

ہی وہ شخص ہے جسکی طرف حق تعالیٰ نے من شرح بالکفر صدہا سے اشارہ فرمایا ہے۔ عمار کو خیال آیا کہ عبد اللہ بن ابی سرح اخیر میں دوبارہ اسلام لے آیا تھا، ہو سکتا ہے کہ اس نے پر خلوص توبہ کر لی ہو، یگانہ سچا مومن بن گیا ہو، اور حق تعالیٰ نے ایمان کی وجہ سے اس کی پشت سے کفر کا بوجھ ہٹا دیا۔ لیکن عبد اللہ کی عملی زندگی پر مصریوں کو طرح طرح کا اعتراض تھا۔ پھر کوفہ اور بصرے سے بھی عاملوں کی شکایتیں آرہی تھیں جو حضرت عثمانؓ کے مقرر کئے ہوئے تھے اور روز بروز شکایتیں بڑھتی جاتی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ نفرت کا جذبہ بھی بڑھتا ہی جا رہا تھا، ان حالات کو دیکھ کر مدینے کے سرکردہ اور ممتاز شہریوں میں نفرت کے جذبات پھیل گئے اور قسم قسم کے اعتراضات اٹھائے جانے لگے پھر سب حضرات کا ایک خفیہ اجلاس ہوا اور وہ موجودہ گڑ بڑ اور بد نظمی کا حل تلاش کرنے لگے۔ پھر حضرت عمار یا تو خود بخود یا مسلمانوں کی طرف سے نمائندہ بن کر حضرت عثمانؓ کی خدمت اقدس میں بات چیت کرنے کے لئے حاضر ہوئے تاکہ انھیں حکام کے رویے کے بارے میں لوگوں کے خیالات سے آگاہ فرمائیں۔ لیکن حضرت عثمانؓ ان کی باتیں سننے پر راضی نہیں ہوئے۔ اس بنا پر بات نے نرا ہی صورت اختیار کر لی اور فتنہ کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ حضرت عثمانؓ نے عمار کو

باہر نکلوا دیا۔ امیر المؤمنین کے غلام انھیں باہر کھینچ لائے اور اس قدر
 دُکوب کیا کہ بے ہوش ہو گئے۔ لوگوں نے خیال کیا کہ جاں بحق ہو گئے
 تھوڑی دیر میں جب عمار کو ہوش آیا تو اٹھ کر کہنے لگے، یہ کوئی نئی بات
 ہے اس سے پہلے بھی میں اللہ کی راہ میں ستایا جا چکا ہے۔ اسی دن
 سے عمار حضرت عثمان کے مخالفوں کی جماعت کے سرغنہ بن گئے۔

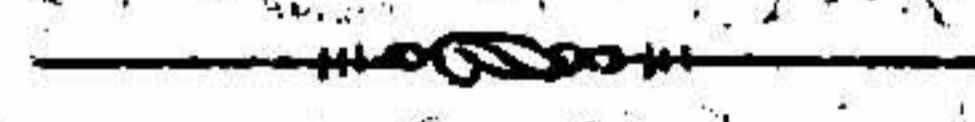
وزیر تعلیم و مال

عمار بن یاسر کے معزول ہو جانے کے بعد عبداللہ بن مسعود پرستور اپنے عہدے پر مامور رہے اور اپنے منصب سے نہیں ہٹائے گئے۔ یہ حسب سابق کوفے کے بیت المال کے افسر کوفیوں کے معلم اور حاکم کے مشیر کی حیثیت سے کوفے میں مقیم رہے انہوں نے کوفیوں کو کمال سرگرمی اور محنت و مشقت سے تعلیم دی اور کچھ ایسی عمدگی اور خوش اسلوبی سے تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیے کہ لوگ انہیں دل و جان سے چاہنے لگے اور آپ کے مخلص معتقد بن گئے۔ آپ نے کوفیوں کے دلوں پر بند و موہبت کے گہرے گہرے نقوش چھوڑے۔ یہ کوئی اچھے کی بات نہیں ہے کیونکہ حضرت ابن مسعود ایک زمانے تک اللہ کے رسول کے ساتھ ایک خادم کی حیثیت سے رہ چکے تھے دن رات آپ کی مبارک صحبت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اکثر لوگ انہیں

خاندان نبوت کا فرد ہی سمجھتے تھے۔ انہوں نے سرکار رسالت کی زبان سے قرآن حکیم کی ستر سورتیں سن کر یاد کر لی تھیں۔ اس قسم کی سعادت کسی کو میسر نہ آئی تھی۔ اللہ کے رسول صلعم کو ان کی قرأت سے بڑی دلچسپی تھی اور عبد اللہ کی قرأت آپ کو بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی، آپ صحابہ کے سامنے ان کی قرأت کی تعریف کرتے تھے اور انہیں بھی اس قرأت کی رغبت دلاتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ آپ نے فرمایا جو شخص قرآن پاک کو اسی طرح تر و تازہ پڑھنا چاہتا ہے جس طرح وہ نازل ہوا تھا تو اسے ابن ام عبد کی قرأت کے مطابق قرآن پڑھنا چاہیے۔ ابن مسعود بنی صلعم کی سنت کے عاشق زار تھے۔ بات چیت میں، کام کاج میں حرکت و ساکن میں، مسائل کے طریق و آداب میں، نازک سے نازک موقعہ پر ثابت قدمی اور استقلال میں اور زندگی کے ہر پہلو میں آپ کی پیروی کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ان کو جاننے والے صحابہ اس بات پر متفق ہیں کہ چال ڈھال، گفتار و کردار، عادات و اطوار اور حسن سیرت میں ابن مسعود ہی اللہ کے رسول سے سب سے زیادہ مشابہ تھے۔ خلیفہ بن بیان فرماتے ہیں، اپنی بیرونی زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشے میں ابن مسعود اللہ کے رسول صلعم سے زیادہ مشابہ ہیں۔ اندرونی زندگی کا حال خدای ہی کو معلوم ہے، صحابہ کرام کا باطن ظاہر سے بدرجہا بہتر ہوتا تھا۔

نے کی اقامت کے زمانے میں ابن مسعود کا یہ دستور العمل تھا کہ روزانہ
 دو گوں کو قرآن پاک پڑھاتے تھے اور ہر جمعرات کو شام کے وقت وعظ
 بصیحت فرماتے تھے، کٹری پر ٹیک لگا کر خطیبہ دیا کرتے تھے اور کافی
 دیر تک بولتے رہتے تھے پھر بولنا بند کر دیتے تھے، اگرچہ حاضرین ابھی
 شہ کام ہی رہتے تھے۔ حاضرین کی تو یہی تمنا ہوتی کہ ابن مسعود بولتے
 ہی رہیں۔ بڑی بڑی لطف جامع اور مواعظ سے پھر پورے تقریر ہوتی تھی۔ ابن
 مسعود روایت بیان کرنے میں بڑی احتیاط برتتے تھے اور ڈرتے ڈرتے
 روایت کرتے تھے، روایات حدیث میں اور حفاظ کی طرح بڑے محتاط
 تھے۔ اللہ کے رسول کی یہ حدیث انہیں معلوم تھی کہ جس نے جان
 بوجھ کر مجھ پر جھوٹ بولا، اُسے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لینا چاہیے۔ اسی
 لئے روایت کرتے وقت ڈرتے تھے کہ کہیں غیر شعوری طور پر کوئی
 غلط حدیث زبان سے نہ نکل جائے۔ ایک دفع اثنائے وعظ میں
 آپ کی زبان پر یہ لفظ آگئے۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی
 یہ الفاظ زبان سے ادا بھی نہ ہوئے پائے تھے کہ تھر تھر کانپنے لگے،
 ہاں تک کہ وہ کٹری بھی جس پر ٹیک لگائے ہوئے تھے پلنے لگی،
 پسینے میں شرابور ہو گئے۔ پیشانی سے پسینے کے قطرے موتیوں کی
 طرح زمین پر ٹپکنے لگے اور فرمایا، آپ نے یہ فرمایا یا اس سے کم و بیش

فرمایا، کوئی کسی حاکم سے اس قدر خوش نہیں ہونے جس قدر
 مسعود اور ابو موسیٰ اشعری سے خوش ہوئے۔ حضرت عمر کی شہادت
 کے بعد بھی ابن مسعود بدستور کوفے کے افسر خزانہ رہے۔ شروع
 شروع میں حضرت عثمان نے بھی انہیں اسی عہدے پر برقرار
 رکھا۔ لیکن جب کوفے کا حاکم ولید بن عتبہ کو بنایا گیا تو کچھ ایسے حال
 پیدا ہو گئے کہ چار و ناچار ابن مسعود کو مخالفت کرنی پڑی۔ اس
 مخالفت سے پیشتر ابن مسعود حضرت عثمان سے بہت خوش
 تھے اور مہر جگہ آپ کی تعریف ہی تعریف کیا کرتے تھے۔



ابن مسعود کی پسلی ٹوٹ گئی

بعض نئی باتیں کوفے میں پیدا ہوئیں، اور بعض نے مدینے میں سر اٹھایا۔ کوفے میں جس نئے فتنے نے سر اٹھایا وہ بیت المال کی نئی پالیسی تھی جس سے ابن مسعود نالال اور غیر مطمئن تھے۔ ولید نے حاکم بنتے ہی بیت المال کا صفایا شروع کرنا چاہا، اخراجات بڑھا دیے اور قوم کی خون پسینے کی کمائی کو بے دردی سے بہانا شروع کر دیا، اور طرفہ تماشایہ کہ بیت المال کو اپنا حق سمجھتے لگا۔ لیکن عبداللہ ابن مسعود عہد فاروقی سے اس نظریے کے حامی تھے کہ بیت المال مسلمانوں کی ملکیت ہے حاکموں کی نہیں، اور حاکموں کا یہ فرض ہے کہ اسے احتیاط سے ٹھیک طور سے خرچ کریں اور انھیں مدوں میں خرچ کریں جن میں عوام کی بہبودی اور فلاح ہو۔ سربراہ آوردہ کو فی بھی ولید کے اس مسرفانہ خرچ سے ہزاروں

متفرک تھے۔ اور حضرت ابن مسعود کے ہم خیال وہم رائے تھے۔ چنانچہ
 ابن مسعود نے یہ فضول خرچی اور مسلمانوں کے مال کی لوٹ مار موقوف
 کرادی۔ ولید کو ابن مسعود کی یہ بات ناگوار گذری اور وہم بدم
 دلوں میں اختلاف بڑھتا ہی گیا۔ شہری ابن مسعود کے حامی تھے،
 انھیں کو چاہتے تھے اور انھیں کی بات مانتے تھے۔ مدینہ النبی میں
 یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت عثمان نے اختلافات دور کرنے کی
 نیت سے قرآن حکیم کو ایک ہی مصحف اور ایک ہی قرأت پر مسلمانوں
 کو جمع کرنے کے لئے ایک مجلس شوریٰ منعقد فرمائی، اور حفاظ کی ایک
 مجلس مشاورت قائم کی، جس کے صدر حضرت زید بن ثابت مقرر
 فرمائے گئے۔ بلاشبہ یہ اقدام حضرت عثمان کے مسلمانوں کی بہبودی
 اور مہر دی کے لئے فرمایا تھا تاکہ اتحاد میں رخنہ نہ پڑنے پائے
 اور اختلافات میں پڑ کر مسلمان راہ سے نہ بھٹک جائیں۔ آخر کار جب
 یہ مصحف عثمانی مکمل ہو گیا تو آپ نے اس کی متعدد کاپیاں کر کے
 اپنی حکومت کے مختلف شہروں میں ایک ایک کاپی بھیج دی اور
 اصل مصحف اپنے پاس محفوظ رکھا۔ اور دیگر قراتوں کے پڑھنے
 کی ممانعت کر دی گئی۔ مصحف عثمانی سے پہلے جس قدر مصاحف
 لکھے گئے تھے سب کو نذر آتش کر دیا گیا۔ ابن مسعود کو یہ بات بری

معلوم ہوئی، چونکہ وہ سب سے اونچے درجے کے قاری اور حافظ تھے، اس لئے انہوں نے حضرت عثمانؓ کے حکم کو ٹھکرا دیا۔ پھر خلیفۃ المسلمین کے اس ہمدردانہ اقدام پر کڑی تنقیدیں بھی کیں، اور کوفے میں ولید کی پالیسی کی بھی سخت سے سخت مذمت کی۔ ابن مسعود ہر وقت یا جمعرات کو تقریر فرماتے تھے۔ تقریر کرتے وقت یہ بھی فرماتے: - **إِنَّ أَصْدَقَ الْقَوْلِ كِتَابُ اللَّهِ وَأَحْسَنَ الْهُدَى هَدَى مُحَمَّدٍ وَشَرُّ الْأُمُورِ مُحَدَّثَاتُهَا وَكُلُّ مُحَدَّثٍ يَدْعُهُ وَكُلُّ يَدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ** (سب سے سچی بات اللہ کی بات ہے، اور سب سے عمدہ طریقہ محمد رسول اللہ صلعم کا طریقہ ہے، بدترین کام ہر نیا کام ہے، ہر نیا کام بدعت ہے، ہر بدعت گمراہی ہے، اور ہر گمراہی جہنم میں لے جائے گی) ولید نے نادانی سے یہ سمجھا کہ ان باتوں سے مجھ پر اور حضرت عثمانؓ پر تعریض و طنز کیا جاتا ہے، اس لئے اس نے ان کلموں سے ابن مسعود کو روکنا چاہا۔ انہوں نے ولید کے حکم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے یہ کلمے جاری رکھے۔ آخر ولید نے جل کر حضرت عثمانؓ کو لکھا، حضرت عثمانؓ نے جواب میں لکھا کہ ابن مسعود کو کوفے سے نکال کر مدینے میں ہمارے پاس بھیج دو۔ ولید نے سرکاری حکم کی تعمیل کی، اور ابن مسعود کو کوفے سے

نکالنے کا فرمان جاری کر دیا۔ علاوہ ازیں خلیفہ المسلمین کا حکم بھی آپ کو پہنچا دیا۔ خیر حکم حاکم مرگ معاجات، ابن مسعود کو چار و ناچار کو ذرا
 چھوڑنا پڑا جب آپ یہاں سے سدھارے تو لاتعداد کوئی آپ کو رخصت
 کرنے کے لئے کرنے سے دور میلوں تک آپ کے ساتھ ساتھ آئے کو فیوں
 کو آپ کی جدائی کا بڑا صدمہ ہوا انھوں نے ہر چند ابن مسعود سے
 درخواست کی کہ وہ کوفہ سے نہ جائیں اور انھیں کے پاس رہیں،
 کیونکہ کو فیوں کو ان پر حضرت عثمان کی جانب سے اندیشہ تھا۔ لہذا
 وہ انھیں ٹھہرانے کی کوشش کرتے رہے اور اپنی ہر طرح کی حمایت و
 اعانت کا انھیں یقین دلاتے رہے کہ کوئی انھیں ٹیڑھی نگاہ سے نہیں
 دیکھ سکتا۔ مگر ابن مسعود نے یہ کہہ کر ٹھہرنے سے انکار کر دیا کہ قنہ تو
 عنقریب اٹھنے والا ہے، پھر میں کیوں اس کی اپنی ذات سے ابتدا
 کروں۔ ابن مسعود مدینہ میں رات کو پہنچے۔ دوسرے روز جمعہ تھا۔
 جمعہ کی نماز پڑھنے کی غرض سے مسجد میں تشریف لائے حضرت عثمان نے
 انھیں دیکھتے ہی منبر سے ڈانٹنا ڈپٹنا اور سخت کست کہنا شروع
 کر دیا۔ ابن مسعود نے عرض کیا کہ میں ایسا نہیں ہوں جیسا تمہارا
 خیال ہے۔ میں بڑے معرکوں (بدر، احد، خندق اور حدیبیہ) میں رسول
 اللہ صلعم کا ساتھی رہا ہوں۔ حضرت مانی عائشہ صدیقہ بھی پردے میں

چیخ کر بولیں، عثمان بڑے افسوس کی بات ہے، تمہیں اللہ کے رسول
 کے ایک محبوب صحابی کو ستاتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ حضرت عثمان
 بولے "ام المؤمنین آپ اس معاملے میں دخل نہ دیں، اور خاموشی اختیار
 فرمائیں۔ حضرت عثمان نے اپنے کڑیل غلاموں کو حکم دیا کہ ابن مسعود
 کو مسجد سے باہر نکال دیں۔ چنانچہ ایک سیاہ فام لمبا ٹرنگا اور کڑیل غلام
 اٹھا اور زبردستی ابن مسعود کو اٹھا کر مسجد سے باہر لائے لگا۔ ابن
 مسعود اُس کے پنجہ جو رو ستم سے چھوٹ جانے کی کوشش کرتے
 رہے۔ اُن کی ٹانگیں غلام کے کندھوں پر آگئی تھیں، اور چیخ چیخ کر
 حضرت عثمان سے کہہ رہے تھے۔ تمہیں خدا کی قسم مجھے میرے دوست
 کی مسجد سے نہ نکالو۔ لیکن غلام نے ایک نہ سستی اور اُنھیں اٹھا کر لے چلا
 گیا۔ اور باہر جا کر زمین پر بیٹھ دیا جس سے اُن کی ایک پسلی ٹوٹ
 گئی، اور انتہائی تکلیف میں اُنھیں گھر لے جایا گیا۔ پھر بات اسی پر
 ختم نہیں ہوئی، بلکہ حضرت عثمان نے دو سال تک اُن کا وظیفہ بھی
 بند رکھا اور جب تک زندہ رہے خلیفہ وقت کے معتبوب رہے
 یہ تو تھی حضرت عثمان کی ایک سیاسی جنبش، لیکن ایک دوست
 اور صحابی کی حیثیت سے آپ ابن مسعود سے ملتے رہے۔ آخر کار جب
 ابن مسعود مرض الموت میں گھر گئے اور حضرت عثمان کو معلوم ہوا کہ

اب ان کی آخری ساتیس ہیں تو اس مقام پر تاریخ دو راہیں بتاتی
 سے حضرت عثمان کے بدخواہ کہتے ہیں کہ ابن مسعود سے صلح و صفائی
 کی کوشش کی گئی، ان سے معافی بھی مانگی گئی، دوبارہ وظیفہ جاری
 کرنے کی پیشکش بھی کی گئی اور استغفار کی بھی درخواست کی گئی۔ مگر
 ابن مسعود نے ہر بات ٹھکرا دی۔ پھر حضرت عثمان نے ام المومنین حضرت
 ام حبیبہ کو بیچ میں ڈالا، مگر ابن مسعود نے یہ بات بھی ٹھکرا دی، اور
 اسی حالت میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ جبکہ دونوں کے تعلقات میں
 کشیدگی تھی۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود وصیت فرمائے
 تھے کہ ان کی نماز عثمان نہ پڑھائیں۔ عمار اس وصیت میں موجود تھے اور
 انھیں نے اس وصیت کو عملی جامہ پہنچایا۔

کہتے ہیں کہ عمار سے حضرت عثمان کی شکر بخئی بڑھ جانے کا سبب سے
 بڑا سبب ہی تھا لیکن حضرت عثمان کے بھی خواہوں اور بہا جرین سے
 اچھا گمان رکھنے والوں کا یہ خیال ہے کہ حضرت عثمان جب ابن
 مسعود کی بیمار پرسی کے لئے تشریف لائے تو ان سے معافی چاہی اور
 عذر پیش کیا۔ ابن مسعود نے عذر قبول کر لیا۔ پھر دونوں حضرات نے ایک
 دوسرے کے لئے دعائے مغفرت فرمائی، اور انتقال کے بعد حضرت
 عثمان ہی نے نماز جنازہ پڑھائی اور ان کی قبر پر کھڑے ہو کر ان کی

تعریف و توصیف میں کمی نہیں کی۔ آخری بات ہی اکابر کے حال کے مطابق موزوں سے اور دل کو بھاتی بھی ہے۔ پھر زبیر بن عوام حضرت عثمان کے پاس آکر کہتے لگے (حضرت ابن مسعود انھیں کچھ وصیت فرمائے تھی) ابن مسعود کا جتنا وظیفہ باقی ہے وہ مجھے عنایت فرما دیجئے کیونکہ ان کی اولاد بیت المال سے زیادہ حقدار ہے۔ "بہت خوب" حضرت عثمان نے فرمایا۔ پھر حضرت عثمان نے ابن مسعود کا نہ صرف باقی وظیفہ بلکہ اس سے بھی دو گنا زبیر کو دے دیا۔ حضرت عثمان کے فرمان پر افسر خزانہ نے حضرت زبیر کو ۲۵ ہزار درہم دیئے۔

چند برس کے بعد کوفی حضرت علی کے پاس جمع ہوئے اور ان کے پاس ابن مسعود کا ذکر چھڑ گیا۔ کوفی حضرت علی سے کہنے لگے :-
 "امیر المؤمنین ہم نے ابن مسعود سے زیادہ عبادت گزار، پارسا، ہنس مکھ، خلیق، رحم دل اور بہتر رفیق کسی کو نہیں پایا۔
 حضرت علی نے فرمایا قسم کھا کر بتاؤ کیا یہ بات تم خلوص دل سے کہہ رہے ہو؟ ہاں ہاں تم قطعاً سچے دل سے کہہ رہے ہو۔" لوگ بولے یا اللہ تو گواہ ہے ان لوگوں نے ابن مسعود کی جو کچھ بھی تعریف کی ہے میں انھیں اس سے بدرجہا بہتر اور صاحب کمال سمجھتا ہوں۔۔۔

بغاوت

جب ملک میں بد نظمی پھیلی اور بغاوت نے سر اٹھایا، تو مدینہ کے کسی باشندے نے حضرت عثمان کی اتنی مخالفت نہیں کی جتنی عمار نے کی۔ رسول اللہ صلعم کے فرمان عالی شان کے مطابق عمار سیدھی راہ پر تھے، تاویل اور تاویل کرنے والوں سے متنفر اور انتہائی بیزار تھے۔ کھری اور بے لاگ بات کو پسند فرماتے تھے۔ واضح عمل کو سراہتے تھے، اور سیدھی سادھی طبیعت کو جو کچی اور ایچ بیج سے خالی ہو اچھی جانتے تھے۔ خالص دین ان کی گھٹی میں پڑا تھا اور دیانت ان کی طبیعت کا اصلی جوہر تھا، دنیا سے قطعی بے پرواہ اور دنیوی فواید و اغراض سے بالکل بے نیاز تھے۔ حق کے ولید اور فتنہ و فساد سے بیزار و خائف رہتے تھے، سیاسی انارچرھاؤ، جوڑ توڑ اور الجھنوں سے قطعی علیحدہ رہتے تھے۔ عمار نے سیرت پیغمبر میں اور صدیق اکبر و

فاروق اعظم کی سیاسی پالیسیوں میں استقلال و ثبات دیکھا تھا جہاں کوئی ایچ پیج یا ایچ جی نہ تھی اور جہاں خلوص ہی خلوص کا فرما نظر آتا تھا اسی بنا پر وہ ایک واضح پالیسی کے قائل تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ سرکاری پالیسی کو واضح اور متعین ہونا ضروری ہے جیسا کہ سابق رہنماؤں نے کی تھی۔

عہد عثمانی میں ملک میں بد نظمی، معاملات میں گڑ بڑ، ذاتی اغراض کا خیال، نفع اندوزی اور حصول زر کار حجان دیکھ کر عمار کو بڑا صدمہ ہوا۔ ان کا قلب اس ملکی بد نظمی اور لوگوں کے خیالات کی پراگندگی کو ایک سکند کے لئے بھی برداشت کرنے کو تیار نہ تھا اور ان کی سادہ طبیعت پر اس گڑ بڑ کا بڑا بھاری اثر پڑا تھا۔ آخر کار ان کے خیالات میں ہیجان اور افکار میں تلاطم پیدا ہونے لگا مگر دل ہی دل میں گھسنے لگے زبان بند کر کے بیٹھ گئے، ملکی معاملات سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور خدا سے پناہ مانگتے رہے کہ وہ انھیں فتنے کی لپیٹوں سے محفوظ رکھے۔ لوگوں سے تبادلاً خیالات کرنے پر معلوم ہوا کہ عوام بھی اس بد نظمی اور ملکی گڑ بڑ کو بڑی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ اب عمار ان مسائل پر سنجیدگی سے غور کرنے لگے۔ معاملات کی حجان بین کرنے کے بعد مسکھوں نے یہی فیصلہ فرمایا کہ لوگوں کو من مانی نہیں کرنے دینی چاہیے۔

بلکہ ان بگڑے ہوئے حالات کی کسی نہ کسی طرح اصلاح کرنی چاہیے ظاہر
 ہے کہ اُچھے ہوئے مسائل کو سلجھانا کوئی آسان کام نہیں بلکہ اربابِ حل
 و عقد کے خلاف آواز اٹھانی پڑتی ہے جس میں ہر طرح کا اندیشہ لاحق
 رہتا ہے۔ لوگ مخالفت پر اتر آتے ہیں اور قتل و خون ریزی تک کی
 بھی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اس لئے عمار نے اس بار بھی خاموش
 ہی رہنے کا عزم کر لیا۔ کافی عرصے تک زبان کو سیسے رکھا اور فتنوں کی
 لپیٹوں سے برابر بچا ہلنگتے رہے لیکن کب تک خاموش رہتے۔ جب پانی
 سر سے اُوچا ہو گیا اور آنکھوں نے بڑے بڑے مہاجرین صحابہ کو اور سن
 رسیدہ اکابر کو اس گڑ بڑ سے متنفر دیکھا تو انہیں اس بات کا قطعی یقین ہو گیا
 کہ وہ سیدھی راہ پر ہیں اور ان کے بھائیوں نے غلط راہ اختیار کر رکھی ہے
 ایک دن مدینہ میں یہ افواہ اُڑی کہ امیر المؤمنین نے بیت المال
 سے کچھ جواہرات لے کر اپنی اہلیہ کے زیورات بنوائے ہیں۔ جب اس
 بات کی تحقیق ہو گئی، تو انصار و مہاجرین نے بڑی لے دے کی اور حضرت
 عثمان کی اس حرکت کو ناپسند فرمایا۔ آخر حضرت عثمان کو بھی خبر ہو گئی،
 اور انہوں نے منبر پر صاف صاف فرما دیا کہ ہم اپنی ضروریات بیت
 المال ہی سے پوری کریں گے اگرچہ لوگ یہ بات ناپسند کریں۔ اس پر
 حضرت علیؑ نے فرمایا کہ ہم آپ کو ایسا کرنے سے روک دیں گے۔ معاملہ

کی نزاکت دیکھ کر عمار بھی بول پڑے کہ میں سب سے پہلے آپ کو
 روک دوں گا۔ حضرت علی کی بات سن کر تو حضرت عثمان خاموش ہو گئے
 تھے مگر عمار کے قول سے انہیں تاؤ آ گیا اور عمار کو خوب ہی صلواتیں
 سنائیں، یہ سے بہا، محاسمت جو دونوں کے درمیان تھی۔ یہ جنگاری اس
 وقت تو دبا دی گئی مگر کچھ نہ سکی، اندر ہی اندر سلگتی رہی پھر بھڑکی تو ایسی
 بھڑکی کہ حضرت عمار کا سر پھوٹ کر دم لیا۔ حضرت عثمان نے پچارے عمار
 کو اس قدر مارا کہ ان کا سر پھٹ گیا اور پٹے پٹے بے ہوش ہو گئے۔
 اسی بے ہوشی کے عالم میں ان کی تین نمازیں ظہر، عصر اور مغرب،
 چھوٹ گئیں، گو ہوش میں آنے کے بعد تینوں نمازیں قصداً کر لی گئیں۔
 مگر حضرت عثمان کی طرف سے ان کے دل میں مخالفت کی آگ بھڑک
 اٹھی۔ کہنے لگے ہم اس سے پہلے بھی اللہ کی راہ میں سزائیں، مار پیٹ اور
 اور ہر طرح کی تکلیفیں جھیل چکے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن اس
 روز سے وہ حضرت عثمان کی مخالفت پر ڈٹ گئے اور ہر وقت ہر مجلس
 میں ان پر سخت سے سخت تنقیدیں شروع کر دیں۔ آخر کار بغاوت کی
 آگ عمار کی پھونکوں سے بھڑک اٹھی اور ملک کے چاروں طرف
 سے باغی جمع ہو کر عثمانؓ سے انتقام لینے کی غرض سے مدینہ میں جمع ہو گئے
 عمار نے ان باغیوں کی فراہمت کا ارادہ نہیں کیا اور نہ ان کی

باغیانہ حرکتوں کی مذمت کی۔ آخر ایک دن باغیوں نے حضرت عثمانؓ
 کو شہید کر دیا تو عمار کو ان کی شہادت کا بھی صدمہ نہیں ہوا، بلکہ کبھی
 کبھی تو وہ یہ کہتے لگتے تھے کہ عثمانؓ رنعود بالشر ایمان پر نہیں مرے۔
 ایک دفعہ حضرت حسنؓ اور عمارؓ میں اسی بات پر خوب گراما گرم بحث ہوئی،
 حسنؓ کہتے تھے حضرت عثمانؓ مومن مرے اور عمارؓ کہتے تھے کافر مرے۔
 آخر حضرت علیؓ کے پاس فیصلہ لایا گیا، آپ نے کمال شفقت و محبت سے
 فرمایا کہ عمار ان فضول بحثوں میں پڑ کر اپنا وقت ضائع نہ کرو۔
 جب حضرت عثمانؓ شہید ہو گئے اور بغاوت نے ملک میں جگہ جگہ
 پادوں جملے تو عمار نے حضرت علیؓ کی حمایت و نصرت میں جان اور دھڑ
 کی بازی لگا دی۔ جب حضرت علیؓ اور معاویہؓ میں جنگ چھڑ گئی تو عمار
 کی تمام بھردیاں حضرت علیؓ کے ساتھ تھیں۔ حضرت عمار پورے یقین
 و بھروسے کے ساتھ جاتے تھے کہ حق علیؓ کے ساتھ ہے اور معاویہ باطل
 پر ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد شاید ہی اس
 سرگرمی اور تندہی سے عمار نے کسی جنگ میں شرکت کی ہو جیسی سرگرمی
 جنگ صفین میں دکھائی۔ اللہ کے نبی صلعم کی وہی بات ان کے دل
 پر نقش تھی کہ تمہیں باغی گروہ قتل کر ڈالے گا۔ عمار جب حضرت
 علیؓ کے لشکر میں ان کی حمایت و نصرت کے لئے نکلے تو رسول اللہ

کا وہ فرمان بالکل واضح ہو کر آپ کے سامنے آ گیا تھا۔ حضرت عمار کو
 پورا یقین تھا کہ معاویہ اور ان کے ساتھی باطل پر اڑے ہوئے ہیں،
 اور یہ جنگ جو انہوں نے آپ کے چچا زاد بھائی سے ٹھانی ہے بالکل
 ایسی ہی جنگ ہے جیسے کافر اللہ کے رسول کی مخالفت میں آپ سے
 کیا کرتے تھے۔ جیسے بدر، احد، خندق وغیرہ۔ اس خیال کو لے کر وہ حضرت
 علی کی حمایت میں پورے خلوص و جاں نثاری کے ساتھ جنگ صفین
 میں شامل ہوئے۔ آج بھی انہیں شہادت کی وہی آرزو تھی جو کبھی اللہ
 کے رسول کے ساتھ کافروں سے جنگ کرتے وقت آرزو ہوا کرتی
 تھی۔ ایک روز وہ فرات کے کنارے جا رہے تھے اور یہ فرما رہے
 تھے اے اللہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ اگر میں اس پہاڑ سے گر کر
 جان دے دوں تو تو راضی رہے گا تو یقیناً میں اس سے گر کر جان
 دے دوں، اور اگر تیری رضا ڈوب مرنے میں معاموم ہو جائے تو میں
 پانی میں ڈوب جاؤں، میں صرف تیری رضا ڈھونڈ رہا ہوں، اور
 اسی لئے اس جنگ میں شریک ہو رہا ہوں۔ مجھے تو یہ امید ہے کہ تو
 مجھے ناکام نہ رکھے گا، جبکہ ہر کام میں مجھے تیری رضا مطلوب ہے۔
 اس موقع پر عمار کی عمر نوٹنے سے آگے بڑھ گئی تھی۔ لیکن خلاف توقع
 ان کی جوانی کا زور اور شباب کی قوت عود کر آئی تھی، جو اس سے پہلے

کبھی کسی جنگ میں دیکھنے میں نہیں آئی تھی، وہ بڑی سرگرمی،
 تندہی، مہر و ثبات اور پامردی سے لڑ رہے ہیں، لڑائی میں
 سب سے آگے آگے ہیں، پیچھے رہنے سے سخت بے زار، موت کے
 آرزو مند اور زندگی سے نالاں، وہ پورے یقین کے ساتھ حق کی
 حمایت میں خدا کی رضا مندی کے لئے لڑ رہے ہیں۔ صفین میں دو دن
 تک بڑی گھسان کی لڑائی ہوئی اور سارا میدان خون سے لالہ زار بن
 گیا، تیسرے دن معاویہ اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے کہ معرکہ کارزار
 کی حالت نازک دکھائی دیتی ہے، ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے عرب
 لڑتے لڑتے فنا ہو جائیں گے۔ البتہ اگر ان کے بندر غلام کی سہی
 پھرتی آجائے تو پھر جلدی ہی فیصلہ ہو جائے گا۔ معاویہ کی مراد
 غلام سے حضرت عمار تھے، اور سبکی سے ان کی پھرتی مراد تھی۔ اس
 دن عمار دن بھر لڑتے رہے اور اپنے بہادرانہ کارناموں سے لوگوں
 کو دنگ کرتے رہے۔ لوگ دیکھ رہے تھے کہ ایک بوڑھا لمبے قد والا
 اور گندم گوں سیاہی ہاتھ میں نیزہ گھماتے ہوئے کمال پھرتی سے
 کبھی ادھر آتا ہے کبھی ادھر جاتا ہے، کبھی اسے جاو بائے اور کبھی
 اسے جاو بھارتا ہے مسلمانوں کی ایک جماعت انھیں بڑے غور سے
 دیکھ رہی تھی اور ان کے بارے میں کچھ چہ میگوئیاں بھی ہو رہی تھیں

اس جماعت کے لوگ حضرت علی کے لشکر میں تھے مگر غیر جانبدارانہ پالیسی اختیار کئے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک خرمیہ بن ثابت انصاری بھی تھے جنہوں نے اللہ کے رسولؐ سے حضرت عمارؓ سے یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ تمہیں باغی جماعت قتل کر ڈالے گی۔ وہ اپنی آنکھوں سے حضرت عمار کو حضرت علی کی حمایت میں لڑتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ مگر انھیں ان کے انجام کا انتظار تھا۔ اس خیال کے چند مجاہد معاویہ کے لشکر میں بھی تھے۔ یہ لوگ گو میدان جنگ میں موجود ہیں مگر جنگ سے کنارہ کش ہیں انھیں بھی عمار کے بارے میں نبی صلعم کا یہ فرمان معام ہے لہذا وہ عمار کے انجام کے منتظر ہیں۔ معاویہ کے لشکر میں اسی خیال کے حضرت عمر کے آزاد کردہ غلام ہتھی بھی تھے، عمار اپنے دستے کے سالار تھے اور سالار کی حیثیت سے جاں توڑ لڑائی میں مصروف تھے۔ لڑتے لڑتے عصر کا وقت آ گیا جب عصر کا وقت آ گیا، جب شام کو سورج کی نیم مردہ اور افسردہ شعاعیں ان جانبا مجاہدوں پر پڑنے لگیں تو عمار کا جوش شہادت میں اور جوش و خروش بڑھ گیا اور کچھ ایسی حالت ان پر طاری ہو گئی جیسے خود فراموش ہوں۔ کیف مسرت میں ڈوب کر اپنے ساتھیوں کو جنگ کی ترغیب دیتے ہوئے بلند آواز سے یہ کہتے ہوئے دشمنوں پر ٹوٹ پڑے کہ مسلمانو مبارک ہو جنت نیزوں کے ساتھ میں ہے، آج میں اپنے دوستوں سے ملوں گا،

رحمۃ للعالمین سے اور ان کے رفقاء سے ملوں گا۔ لڑتے لڑتے شام ہوگی
منہ پر روزہ تھا، لوگوں سے کہا کچھ پلاؤ، روزہ کھول لوں، کسی نے انہیں
تھوڑا دودھ دیا، دودھ دیکھ کر مسکرائے اور پینے کے بعد بولے، اللہ
کے رسول نے مجھ سے فرمایا تھا کہ دودھ تمہاری آخری غذا ہوگی، پھر
تم خدا سے جا ملو گے۔ پھر لڑائی پر لوگوں کو آمادہ کرنے لگے اور بلند آواز سے
بار بار یہ لفظ دہرانے لگے، مسلمانو مبارک ہو جنت ینزوں کے سائے میں
ہے پیاسا گھاٹ پر دوڑ کر آتا ہے، میں گھاٹ کے اندر اتر چکا ہوں،
آج میں اپنے دوستوں سے ملوں گا، رحمۃ للعالمین اور ان کے رفقاء
سے ملوں گا۔ آخر حضرت علی کی فوج میں کچھ آثارِ ہریمیت پیدا ہونے لگے،
لیکن ان عارضی آثار سے عمار کے دل میں ذرہ برابر بھی ضعف نہ پیدا
ہوسکا اور نہ ان کا یقین متزلزل ہوسکا۔ فرمانے لگے، خدا کی قسم اگر دشمن
مقام بجز تک بھی پیچھے ہٹا دے تب بھی میرے اس یقین میں خلل نہ آئے گا
کہ ہم حق پر ہیں اور وہ باطل پر ہیں، اس موقع پر حضرت معاویہ کے لشکر کا جھنڈا
عمرو بن العاص کے ہاتھ میں تھا۔ حضرت عمار نے انہیں دیکھتے ہی فرمایا میں
اس علمبردار سے تین دفعہ اللہ کے رسول کے ساتھ لڑ چکا ہوں اور اب یہ
چوتھا موقع ہے عمار کے علمبردار ہاشم بن عتبہ تھے جو بھینگے تھے عمار انہیں
لڑائی کی خوب ترغیب دیتے اور کبھی ڈانٹ کر بھی کہتے کہ او بھینگے

آگے بڑھ، کبھی محبت و پیار سے اُکساتے اور فرماتے ہاشم تم پر میرے
 ماں باپ قربان آگے بڑھتے رہو۔ تم بھی عجیب آدمی ہو، بھئی میں علم کو
 سنبھالے ہوئے دشمن کی طرف بڑھ تو رہا ہوں، مجھے حق تعالیٰ سے قوی
 اُمید ہے کہ میری ہی علمبرداری میں فتح نصیب ہوگی اور میری تمنا
 برآئے گی، تم جانتے ہو جلد بازی میں ہلاکت ہے۔ علمبردار نے کہا۔
 ”میاں آگے بڑھو میرے ماں باپ تم پر قربان آگے بڑھو: عمار نے مسکاکر
 کہا۔ یہ کہہ کر عمار دشمن کی عنقیں چیرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے، اور
 اُن کے پیچھے پیچھے اُن کا علمبردار بھی آگے بڑھتا ہوا آتا رہا۔ ”اللہ کے
 پاس کون چلتا ہے، جنت میں کون جانا چاہتا ہے؟“ عمار نے چیخ کر کہا
 اور کمال جوش و خروش سے دشمن پر ٹوٹ پڑے آخر کار لڑتے لڑتے معرکہ کارزار
 میں شہادت کی سعادت سے سرفراز ہو گئے۔ خزیمہ بن ثابت نے انھیں شہید دیکھ کر
 فرمایا لو اب فیصلہ ہو گیا حق اور باطل معلوم ہو گیا یہ کہا اپنے خیمے میں گھسے
 اندر جا کر غسل فرمایا، بدن پر ہتھیار سجائے اور تاوار سونت کر شامی فوج
 پر ٹوٹ پڑے اور سخت گھمسان لڑائی میں لڑتے ہوئے وہ بھی اللہ کو پیار
 ہو گئے۔

حاجت نہیں ہے تیرے شہیدوں کو غسل کی
 قاتل وہ اپنے خون میں خود ہی بہنا چکے

چوتھے دن کی صبح ہوئی اور ہنسی کو عمار کی شہادت کی خبر ملی، دوڑے اور دوڑے عمرو بن العاصؓ کے پاس پہنچے، عمرو پلنگ پر بیٹھے ہوئے احباب سے گفتگو میں مصروف تھے۔ ہنسی نے آواز دی: "ابو عبد اللہ! عمرو نے جواب دیا: کیا بات ہے؟ ہنسی بولا: "اگر تکلیف نہ ہو تو میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں، براہ کرم ادھر تشریف لے آئیے۔" عمرو بن العاص اٹھ کر اس کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے، ہنسی نے پوچھا: "ابو عبد اللہ! کیا آپ نے عمار کے بارے میں کچھ اللہ کے رسولؐ سے سنا تھا؟" عمرو بولے: "ہاں، آپ نے ان کے بارے میں فرمایا تھا کہ ہمیں باغی جماعت مار ڈالے گی! ہنسی نے کہا: "اچھا تو اب وہ شہید ہو چکے ہیں۔" عمرو نے تیوری پر بل ڈال کر کہا: "ہنسی نہیں، غلط بات ہے، کون کہتا ہے؟" ہنسی نے سنجیدگی سے کہا: "میں نے خود اپنی آنکھوں سے انھیں میدان کارزار میں مقتول دیکھا ہے۔" عمرو نے بے صبری سے کہا: "ہائیں! تم نے دیکھا ہے؟ اچھا تو جل کے مجھے دکھاؤ۔"

عمرو اور ہنسی دونوں میدان کارزار میں جاتے ہیں، اور عمار کی لاش کو شہیدان جنگ میں پڑا ہوا دیکھتے ہیں۔ عمار کو شہید دیکھ کے عمرو کے چہرے پر ہوا یاں اڑنے لگتی ہیں اور چہرہ زرد پڑ جاتا ہے۔ "تم نے غور نہیں کیا، حقیقت میں عمار کے وہ لوگ قاتل ہیں جو انھیں میدان

جنگ میں لے کر آئے۔ عمرو نے ایک طرف ہو کر بات بناتے ہوئے کہا،
 شام کو شہادت سے کچھ دیر پیشتر عمار وصیّت کر گئے تھے کہ نہ مجھے غسل
 دینا اور نہ مجھے جلدی دفن کرنا کیونکہ مجھ پر جھگڑے کے فیصلے کا وارو
 مار ہے۔ حضرت علیؓ نے حضرت عمار کے جنازے کی نماز پڑھائی اور انہیں
 غسل نہیں دیا اور فرمایا، اگر کسی مسلمان کے دل پر عمار کی شہادت کا کچھ
 اثر نہ ہو، وہ اسے اہم نہ سمجھے اور اس کا اس واقعہ سے دل نہ دکھے تو وہ
 بُرا نادان انسان ہے۔ خدا عمار کو جو رحمت میں جگہ عطا فرمائے
 وہ اس دن بھی قابلِ رحم تھے جس دن اسلام لائے۔ آج شہادت کے
 موقع پر بھی قابلِ رحم ہیں، اور جس دن زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے
 اس دن بھی ان پر اللہ پاک رحم فرمائے گا۔ میں نے انہیں اس وقت
 رحمتاً للعالمین کے ساتھ دیکھا تھا جب صرف چار پانچ اشخاص کو ایمان
 کے اعلان کی توفیق بخشی گئی تھی۔ میں نے غور کیا ہے کہ اگر آپ کے چار
 صحابہ کا نام لیا جاتا تو چوتھے عمار ہوتے اور اگر پانچ کا نام لیا جاتا تو
 پانچویں عمار ہوتے۔ اکابر صحابہ میں سے کوئی بھی عمار کے جتنی ہونے
 میں شک نہیں کرتا تھا۔ عمار کو جنت الفردوس مبارک ہو اور وہ وہاں کی بہاریں
 ہوں۔ عمار کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا تھا کہ حق انکے اور وہ حق کے ساتھ ہیں خواہ
 بھی ہمیں عمار اور حق ساتھ ساتھ ہیں، ان کا قاتل یقیناً جہنمی ہے۔

عمار کا قاتل جہنمی ہے

دو شامی مجاہد معاویہ کے خیمے کے پاس پہنچے، اس وقت عمرو بن العاص، عبداللہ بن عمرو اور دیگر معزز حضرات حاضر دربار تھے۔ یہ دونوں شخص عمار کے قتل میں جھگڑ رہے تھے۔ ہر شخص یہی کہتا تھا کہ عمار کا میں قاتل ہوں۔ تم میں سے کوئی اپنے ساتھی کی بات مان لے کیونکہ تم دونوں کا جھگڑا جہنم کے لئے ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ عمار کو باغی گروہ قتل کر دے گا، ان کا قاتل اور ان پر تلوار سونٹنے والا دونوں جہنمی ہیں۔ عبداللہ بن عمرو نے سنجیدگی سے فرمایا۔

معاویہ برہم ہو کر عمرو بن العاص سے مخاطب ہوئے: "عمرو! تم اس دیوانے کو ہم سے ہٹاتے کیوں نہیں؟"

معاویہ نے عبداللہ کی طرف دیکھ کر کہا: "اچھا! اگر تیری یہی رائے ہے جس کا تو نے اظہار کیا ہے تو ہمارے ساتھ کیوں ہے؟"

عبداللہ نے جواب دیا: "ایک دفعہ آبا جان نے اللہ کے رسولؐ فداہ
ابنی و اُمی سے میری شکایت کی تھی اس پر آپ نے مجھے سمجھایا تھا کہ
جب تک تمہارا باپ زندہ رہے اُس کے فرماں بردار بیٹے بن کر رہنا۔
اسی وجہ سے میں آبا جان کے کہنے سننے سے یہاں آ گیا، لیکن جنگ
سے کنارہ کش رہا ہوں۔"

معاویہؓ نے سنجیدگی سے جواب دیا: "نادان! عمار کے قاتل ہم کیوں
ہونے لگے، عمار کی قاتل وہ جماعت ہے جو انھیں میدان جنگ میں لائی۔"
اس واقعہ کو کافی عرصہ گزر چکا، معاویہ اسلامی حکومت کے خود
نختار بادشاہ بن گئے اور مکمل اقتدار حاصل کر چکے۔ عمرو بن العاص اپنے
اجباب و رفقاء سے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں، اتنے میں کچھ لوگ آ کر
عرض کرتے ہیں: "ابو عبداللہ! ہم دیکھا کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ
آپ سے محبت کرتے تھے، آپ کو افسر بناتے تھے اور بڑے بڑے
عہدے دیتے تھے۔"

عمروؓ نے جواب دیا: افسری اور عہدوں کی بابت مجھے معلوم نہیں کہ
آیا واقعی محبت کی بنا پر آپ مجھ سے یہ ساوک فرماتے تھے یا تالیفِ قلب
کی خاطر، لیکن ہم نے دو شخصوں کو دیکھا ہے جن سے آپ آخری دم
تک محبت کرتے رہے اور خوش رہے۔"

لوگوں نے پوچھا: وہ کون سے دو سعادت مند انسان تھے؟
 عمرو نے جواب دیا: ابن مسعود اور عمار بن یاسر۔
 لوگوں نے تعجب سے کہا: ہائیں، عمار، عمار بن یاسر! کیا کہہ رہے ہو؟
 انھیں تو صفین میں تمہیں نے شہید کیا تھا؟
 عمرو نے جواب دیا: بے شک بے شک، تمہارا کہنا بجا ہے، ہمیں
 نے انھیں مارا اور ہمیں ان کے قاتل ہیں!
 شہادت کے وقت عمار نے دستے کے سالار تھے اور ان کے
 پر ذوالکلاع حمیری دشمن کی فوج کے دستے کے سالار تھے۔ دونوں
 سالار اسی جنگ میں ڈھیر ہو گئے۔ ابن سعد سے مروی ہے کہ ابو مسر
 عمرو بن شریک نے جو ابن مسعود کے ایک اور مخلص دوست تھے، اپنا
 ایک خواب بیان کیا کہ میں نے ایک ہلکا باغ دیکھا، اس باغ میں
 کچھ گنبد تھے جن میں عمار سکونت پذیر تھے اور دیگر گنبدوں میں
 ذوالکلاع پھرے ہوئے تھے۔ میں نے تعجب سے پوچھا کہ یہ کیا بات
 قاتل اور مقتول دونوں جنت میں؟ ابن مسعود نے مجھے جواب دیا
 کہ انھوں نے اپنے رب کو بڑی وسیع مغفرت والا پایا۔
 ”زندگی کے زرد رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی“

نتیجہ

داستان سنانے والا جب اس مقام پر پہنچا تو اس نے اپنا سر جھکا لیا اور کافی دیر تک سر جھکائے ہوئے کچھ سوچتا رہا۔ سامعین نے سمجھا کہ داستان ختم ہو گئی اور داستان گو اب مہر سکوت نہ توڑے گا، اس خیال سے وہ اٹھ کر جانا ہی چاہتے تھے کہ اس نے سر اٹھا کر

گرج دار آواز میں یہ آیت پڑھی:

وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضِعُوا فِي

الْأَرْضِ وَنَجْعَلُهُمْ أُتَمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۝

وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِي فِرْعَوْنَ وَ

هَامَانَ وَجُنُودَهُمْ مَّا كَانُوا يَحْذَرُونَ ۝

ہم ملکی کمزوروں پر احسانات رکھنا چاہتے ہیں، انہیں پیشوا بنانا

چاہتے ہیں، انہیں مالک بنانا چاہتے ہیں اور انہیں ملک میں طاقت

بخشنا چاہتے ہیں، اور فرعون، ہامان اور دونوں کے لشکروں کو ان کی

طرف سے وہ دکھانا چاہتے ہیں جس کا انہیں ڈر تھا۔

پھر قدرے خاموش رہ کر کہنے لگا، حق تعالیٰ نے اپنا وعدہ سچا فرمایا، ان کمزوروں اور بے بسوں کو دنیا کا وارث بنایا، انہیں قمیصر و کسریٰ کی دولتیں اور حکومتیں بخشیں، انہیں جب تک وہ زندہ رہے لوگوں کا پیشوا اور قائد بنایا، اور جب انہیں جو ار رحمت میں بلا لیا تو دائمی نعمتوں سے سرفراز فرمایا اور رہتی دنیا تک انہیں دائمی زندگی عطا فرمائی۔ ان کے کارنامے قابل تقلید، ان کی سیرت اسوہ حسنہ اور ان کے اخلاق انسانی زندگی کے لئے اعلیٰ نمونے قرار دیے۔ قیامت تک وہ مسلمانوں کے امام و سرور ہیں۔

میلان (اطلی) پر کیفی

ستمبر ۱۹۴۹ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

157

سچا وعدہ

ڈاکٹر ظہیر حسین کی
کی تصنیف الوعد الحق کا
اردو عکس

ناشران

ولی محمد اینڈ پبلسٹرز تاجران کتب

اوٹ رام روڈ - پاکستان چوک - کراچی

(مشہور آڈیو کاسٹس کراچی)